www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

February 2000 • No. 279

فروری 2000 شمارہ نمبر279

فہرست

جہادِ اکبر	4
حقیقت پسندی	5
دانش مند کون	9
حق غالب رہا	11
ایک کتاب	16
چترکوٹ کا سفر	19

جہادِ اکبر

حدیث میں آیا ہے کہ مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس کے خلاف جہاد کرے (احمد، الترمذی)۔ اپنے آپ کو برے جذبات سے اور برے اعمال سے روکنا بے حد مشکل کام ہے۔ اس کے لئے اپنی خواہشات سے لڑنا پڑتا ہے۔ اس لئے اس کام کو اسلام میں جہاد اکبر کہا گیا ہے۔

صوفیوں کی زندگی اسی جہاد اکبر کا نمونہ ہے۔ اس جہاد میں خود اپنے آپ سے لڑنا پڑتا ہے۔ نفرت، حسد، گھمنڈ، بخواہی، غصہ اور منفی سوچ جیسی برائیوں کو اپنے اندر سے نکالنے کے لئے خود اپنے آپ سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اس جہاد کے نتیجہ میں وہ انسان بنتا ہے جس کو قرآن میں ربانی انسان کہا گیا ہے۔ سماج میں امن اور محبت کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ خیر خواہی اور انسانی احترام کا ماحول قائم ہوتا ہے۔ ہر قسم کی مثبت قدریں فروغ پاتی ہیں۔ انسانی تعمیر کا کام موافق ماحول میں ہونے لگتا ہے۔

اس کے برعکس سیاسی لیڈر جس جہاد کی نمائندگی کرتے ہیں وہ دراصل جہاد کے نام پر فساد ہے۔ اس خود ساختہ سیاسی جہاد میں دوسروں کے خلاف لڑائی چھیڑی جاتی ہے۔ اس میں نفرت اور تشدد پھیلتا ہے۔ امن وسکون ختم ہو جاتا ہے۔ قیمتی جانیں ہلاک ہوتی ہیں۔ انسانوں کو بے عزت کیا جاتا ہے۔ تعمیر وترقی کے تمام کام ٹھپ ہو جاتے ہیں۔ اس کے ذریعہ کوئی نئی چیز حاصل نہیں ہوتی اور جو کچھ حاصل تھا وہ بھی کھو دیا جاتا ہے۔

سیاسی لیڈروں کا یہ نام نہاد جہاد قرآن کی اس آیت کا مصداق ہے: ''اور جب وہ پھرتا ہے تو زمین میں سرگرم ہوتا ہے تاکہ وہ زمین میں فساد پھیلائے اور کھیتوں اور جانوں کو ہلاک کرے۔ حالاں کہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا'' (البقرہ ۲۰۵) معلوم ہوا کہ جو سرگرمی اپنے نتیجہ کے اعتبار سے فساد اور خوں ریزی کا سبب بنے وہ اللہ کی مرضی کے مطابق نہیں۔ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اسی طرح سچے اسلامی جہاد کی پہچان یہ ہے کہ وہ انسانی سماج کے لئے رحمت اور برکت کا ذریعہ ثابت ہو۔

حقیقت پسندی

خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق کا ایک قول ہے: **لیس العاقل الذی یعرف الخیر من الشر و لکنه الذی یعرف خیر الشرین (العبقرایات الاسلامیة، ص ۵۰۵)** یعنی دانش مند وہ نہیں ہے جو شر کے مقابلہ میں خیر کو جانے۔ بلکہ دانش مند وہ ہے جو یہ جانے کہ دو شر میں سے بہتر شر کون سا ہے۔

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک فرد اور دوسرے فرد یا ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان نزاعات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک اور دوسرے کے درمیان اختلافات ظہور میں آتے ہیں۔ ایسے مواقع پر ہمیشہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ معاملہ کو طے کرنے کی صورت کیا ہو۔ وہ کون سا رہنما اصول ہے جس کی روشنی میں باہمی نزاعات کو طے کیا جائے۔

ایسے موقع پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ معاملہ کو خیر اور شر یا انصاف اور بے انصافی کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے حصے میں شر نہ آئے بلکہ خیر آئے۔ وہ اپنے آپ کو بے انصافی سے بچائیں اور جو انصاف ہے اس کو حاصل کریں۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کے لوگ اپنے مقصد کے حصول میں ناکام رہتے ہیں۔ ساری کوشش کے باوجود آخر میں انھیں شکایت اور نقصان کے سوا کچھ اور نہیں ملتا۔

اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں کوئی بھی شخص اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ نہیں لے سکتا۔ اس طرح کے معاملہ میں ہر نزاع کے دو فریق ہوتے ہیں۔ کسی بھی فیصلہ کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ایک فریق کے ساتھ دوسرا فریق بھی اس پر راضی ہو۔ ایک فریق جس چیز کو خیر یا انصاف سمجھتا ہو، اگر دوسرا فریق اس کو تسلیم کرنے پر راضی نہ ہو تو اس کا نتیجہ دو طرفہ ٹکراؤ ہوگا۔ اور ٹکراؤ ہمیشہ مسئلہ کو بڑھانے والا ہوتا ہے نہ کہ اس کو گھٹانے والا۔

ایسی حالت میں دانش مندی کا تقاضا کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ معاملہ کو خیر اور شر یا انصاف اور بے

انصافی کی نظر سے نہ دیکھا جائے بلکہ اس کو ممکن اور ناممکن کی نظر سے دیکھا جائے۔ پھر جو چیز عملی طور پر ممکن ہے اس کو لیا جائے اور جو چیز عملی طور پر ناممکن ہے اس کو چھوڑ دیا جائے۔

اس معاملہ کی ایک تاریخی مثال یہ ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان فلسطین کے مسئلہ پر نزاع پیدا ہوئی جو اس کے بعد پچاس برس تک چلتی رہی۔ یہودیوں کا یہ کہنا تھا کہ دو فریقوں کے درمیان امن کا معاہدہ ہو جائے۔ لیکن عرب اس کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ امن صرف عدل کی بنیاد پر ہو سکتا ہے، عدل نہیں تو امن بھی نہیں۔ مگر بے شمار قربانیوں کے باوجود عربوں کا یہ نظریہ فیل ہو گیا اور بیسویں صدی کے آخر میں انھوں نے عدل کی شرط کو پس پشت ڈال کر صرف امن کے مقصد کے تحت اسرائیل سے معاہدہ کر لیا۔

نظری طور پر یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ جب دو فریقوں میں نزاع کی صورت پیدا ہو جائے تو ان کے درمیان امن کا قیام عدل کی بنیاد پر ہونا چاہئے۔ آئیڈیلزم کے اعتبار سے یہ نظریہ بہت اچھا ہے مگر عملی اسباب بتاتے ہیں کہ اس قسم کا آئیڈیل کبھی قابلِ حصول نہیں ہوتا۔ اس طرح کے نزاعی معاملات میں دانش مندی یہ ہے کہ آدمی نظری انصاف پر اصرار نہ کرے بلکہ عملی انصاف پر راضی ہو جائے۔

اصل یہ ہے کہ امن اور انصاف کو ایک دوسرے کے ساتھ بریکٹ کرنا بجائے خود غلط ہے۔ اس دنیا میں امن انصاف کے لیے نہیں ہوتا۔ امن کا تعلق مواقع کار سے ہے، نہ کہ عدل و انصاف سے۔ امن اس لیے حاصل نہیں کیا جاتا کہ اس کے ساتھ انصاف حاصل ہو جائے۔ بلکہ امن اس لیے قائم کیا جاتا ہے تاکہ وہ مواقع کار حاصل ہوں جن کو استعمال کر کے عدل و انصاف تک پہنچا جا سکے۔

مثال کے طور پر ۱۹۴۸ میں فلسطین کی جو صورتحال تھی اس میں عربوں کو فلسطین کا بیشتر حصہ ملا ہوا تھا۔ اس وقت دانش مندانہ پالیسی یہ تھی کہ اس صورتحال کو قبول کر کے یہودیوں سے وہ صلح کر لی جائے جو پچاس برس بعد کی گئی۔ اگر ایسا کیا جاتا تو اس کا زبردست فائدہ ہوتا۔ اس طرح عربوں کے لیے ممکن تھا کہ وہ امن قائم کر کے اپنے تعمیر و استحکام کی جدوجہد شروع کر دیں۔ پچھلے پچاس برس میں

انھوں نے انصاف کے حصول کے نام پر بے شمار دولت ضائع کی ہے۔ اور لاکھوں قیمتی جانوں کا نقصان کیا ہے۔ قیام امن کی صورت میں ان کا یہ تمام سرمایہ تعمیر واستحکام کے محاذ پر لگ جاتا۔ اس مثبت پالیسی کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ ان تمام چیزوں کو لڑائی کے بغیر کامیاب طور پر حاصل کر لیتے جس کو وہ لڑائی کے ذریعہ ناکام طور پر حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

اس معاملہ کی بہترین مثال اسلام کے دور اول کا وہ تاریخی واقعہ ہے جس کو صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرک قبائل کے درمیان زبردست نزاع تھی۔ ان مشرکین نے آپ کو آپ کے وطن مکہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور مسلمانوں کے خلاف دوسری بہت سی ناانصافیاں کر رہے تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اگر امن کے حصول کے لئے عدل کی شرط لگاتے تو دونوں فریقوں کے درمیان کبھی امن قائم نہ ہوتا۔ مگر آپ نے یہ کیا کہ عدل وانصاف کے سوال کو الگ کر کے مشرکین سے گویا ''امن برائے امن'' کے اصول پر صلح کر لی۔ اس امن کو آپ نے کام کے ایک موقع کے طور پر لیا۔ اور اس کو اسلام کی تعمیر واستحکام کے لیے استعمال کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف دو سال کے اندر مزید اضافہ کے ساتھ وہ سب کچھ حاصل ہو گیا جس کو آپ نے بظاہر معاہدہ امن کے وقت کھو دیا تھا۔

دانش مندی کا یہ اصول جس طرح اجتماعی نزاعات کے لیے ہے، اسی طرح وہ انفرادی نزاعات واختلافات کے لیے بھی ہے۔ انفرادی معاملات میں بھی کامیابی کا واحد طریقہ یہی ہے کہ خیر اور شر یا صحیح اور غلط کی بنیاد پر معاملات کو طے کرنے کے بجائے ممکن اور ناممکن کی بنیاد پر ان کو طے کیا جائے۔

گھر کے اندر دو مردوں یا دو عورتوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو تو یہ نہیں دیکھنا چاہئے کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا ہے بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ عملی حالات کے اعتبار سے ممکن کیا ہے اور ناممکن کیا ہے۔ حق اور ناحق یا صحیح اور غلط کی بحث میں پڑنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اختلاف کبھی ختم نہ ہوگا۔ اس کے برعکس اگر

آپ ممکن پر راضی ہو جائیں تو بیک وقت آپ کو دو فائدے حاصل ہوں گے ــــــــ اختلاف کا فوری خاتمہ اور مواقعِ کار کا حصول۔

یہی اصول تمام انفرادی نزاعات کے لیے ہے۔ زندگی کی سرگرمیوں کے درمیان ہر شخص کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ اختلاف اور نزاع کی صورتیں پیش آتی ہیں۔ کبھی مالی اور کبھی غیر مالی۔ ایسے مواقع پر جو شخص حق اور باطل یا صحیح اور غلط کی بحث چھیڑے وہ بلاشبہہ غیر دانش مند انسان ہے۔ اس کے بجائے جو عملی تقاضوں کو سمجھے اور ان کی رعایت کرتے ہوئے ممکن پر راضی ہو جائے تو ایسا ہی شخص عقل مند ہے، اور یہی وہ شخص ہے جو اس دنیا میں کامیابی حاصل کرے گا۔

اجتماعی زندگی میں جب بھی کوئی نزاع پیدا ہو تو لوگوں کی توجہ تمام تر اس پر لگ جاتی ہے کہ از روئے انصاف کیا ہونا چاہئے یا ان کے نزدیک اس معاملہ میں حق کیا ہے اور پھر اس حق کے حصول کے لئے فریق ثانی سے لڑائی چھیڑ دیتے ہیں۔ یہ لڑائی اکثر سالہا سال تک جاری رہتی ہے اور اکثر کسی مثبت نتیجہ تک نہیں پہنچتی۔ اس طرح کے موقع پر دوسرا طریقہ یہ ہے کہ یہ سوچا جائے کہ مفروضہ حق کے حصول میں جو وقت اور طاقت خرچ ہوگی اس کو مقابلہ آرائی سے بچا کر اپنی مثبت تعمیر میں استعمال کیا جائے۔

ٹکراؤ ہمیشہ حق کے حصول کے نام پر کیا جاتا ہے۔ مگر عملی طور پر ٹکراؤ کا نتیجہ ہمیشہ یہ نکلتا ہے کہ اس کے دوران نہایت قیمتی مواقع ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس دنیا میں عقلمندی یہ ہے کہ ہر معاملہ میں یہاں عملی نقطۂ نظر اختیار کیا جائے۔ ایک شخص اپنی ذاتی زندگی میں آئیڈیل کو اپنا نشانہ بنا سکتا ہے، مگر جب اجتماعی زندگی کا معاملہ ہو تو اس کو ہمیشہ پریکٹکل بن جانا چاہئے۔

دانش مند کون

ایک برطانوی مصنف ولیم رالف انگ (William Ralph Inge) کا قول ہے کہ ـــــــ دانش مند وہ ہے جو چیزوں کی اضافی قدر کو جانے:

The wise man is he who knows the relative value of things.

اس قول کا مطلب کیا ہے اس کو مثال سے سمجھئے۔ ایک طالب علم کو امتحان دینا ہے۔ وہ وقت کے مطابق اپنے گھر سے اسکول کے لئے روانہ ہوتا ہے۔ راستہ میں ایک جاہل لڑکا اس سے الجھ جاتا ہے اور اس کو گالی دیتا ہے جس کے نتیجہ میں طالب علم کو غصہ آجاتا ہے۔

اب طالب علم اگر غصہ ہو جائے اور مذکورہ لڑکے سے انتقام لینے کے لئے اس سے الجھ جائے تو عین ممکن ہے کہ اس جھگڑے میں اتنی زیادہ دیر ہو جائے کہ وہ وقت پر امتحان حال تک نہ پہنچے اور نتیجۃً اس کا ایک سال ضائع ہو جائے۔

اسی طرح ایک شخص کو ضروری سفر کرنا ہے۔ وہ گھر سے روانہ ہوتا ہے تاکہ ریلوے اسٹیشن پہنچے اور ٹرین پر سوار ہو کر وقت پر اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے۔ لیکن جب وہ گھر سے نکلا تو راستہ میں ایک شخص سے اس کا جھگڑا ہو گیا۔ اب اگر وہ دیر تک اس آدمی سے جھگڑتا رہے تو عین ممکن ہے کہ اس کو اتنی زیادہ دیر ہو جائے کہ جب وہ ریلوے اسٹیشن پہنچے تو اس کو معلوم ہو کہ اس کی ٹرین چلی گئی۔

ان مثالوں پر غور کیجئے۔ مذکورہ دونوں شخصوں کا ایک مسئلہ وہ تھا جو خود مقام واقعہ پر موجود تھا۔ یعنی ایک شخص کا انھیں گالی دینا یا زیادتی کرنا۔ یہ معاملہ کا وہ پہلو تھا جو براہ راست عین موقع کے وقت دکھائی دے رہا تھا۔ اسی کے ساتھ وہاں ایک چھپا ہوا پہلو بھی تھا جو بظاہر مقام واقعہ پر موجود نہ تھا مگر ایک صاحب بصیرت آدمی غور کر کے اسے جان سکتا تھا۔ وہ یہ کہ اگر ان جاہلوں سے ٹکراؤ کیا جائے اور ان کو سزا دینے کی کوشش کی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک اور انتہائی اہم مصلحت تباہ ہو جائے گی۔ یعنی وقت پر امتحان ہال یا ریلوے اسٹیشن نہ پہنچنا اور محض ایک وقتی نوعیت

کی جذباتی تسکین کی خاطر زیادہ بڑے فائدہ سے اپنے آپ کو محروم کر لینا۔

مذکورہ قول میں اسی دوسرے یا بظاہر دکھائی نہ دینے والے پہلو کو معاملہ کا اضافی پہلو کہا گیا ہے۔ معاملہ کا ابتدائی پہلو، یعنی زیادتی کرنے والے کی زیادتی، ہر آنکھ والا دیکھتا ہے مگر معاملہ کے دوسرے پہلو یا اضافی قدر (relative value) کو وہی شخص دیکھے گا جو گہری بصیرت کا حامل ہو اور اپنے اقدام کا فیصلہ عقلی غور وفکر کے تحت کرتا ہو نہ کہ محض وقتی جذبات کے تحت۔

موجودہ دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں اکثر معاملات میں یہ دونوں پہلو موجود ہوتے ہیں۔ غیر دانش مند آدمی صرف سامنے کی صورت حال کو دیکھ پاتا ہے اور اس کے مطابق کارروائی کر کے اپنے معاملے کو بگاڑ لیتا ہے۔ دانش مند انسان وہ ہے جو معاملہ کے دیگر پہلوؤں کو دیکھ سکے۔ جو سامنے کی صورت حال سے اوپر اٹھ کر ان حقیقتوں کا ادراک کر لے جو اگرچہ مقام واقعہ پر موجود نہیں مگر آخر کار ظاہر ہو کر وہی فیصلہ کن بن جائیں گی۔

موجودہ دنیا اسی دانش مندی کا امتحان ہے۔ جو آدمی اس اعتبار سے دانش مند ثابت ہو وہی اس دنیا میں کامیاب ہوگا۔ اور جو آدمی اس دانش مندی کا ثبوت نہ دے سکے اس کے لئے یہاں ناکامی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

حق غالب رہا

اسلام خدا کا آخری دین ہے۔ آخری دین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے لئے خدا نے یہ مقدر کر دیا ہے کہ وہ قیامت تک ایک محفوظ اور زندہ مذہب کی حیثیت سے باقی رہے۔ ہر چیلنج اس کے لئے زندگی کا ایک نیا موقع ثابت ہو۔ ہر چیلنج اس کے لئے ایک اسٹپنگ اسٹون بن جائے۔ یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے۔ **الاسلام یعلو و لا یعلیٰ** (صحیح البخاری، کتاب الجنائز) تاہم اسلام کا یہ علوفکری اور تاریخی معنی میں ہے، وہ سیاست اور اقتدار کے معنی میں نہیں ہے۔ سیاسی اقتدار، خدا کے قانون کے مطابق بدلتا رہتا ہے (آل عمران ۱۴۰)۔ مگر فکری اور نظریاتی سربلندی جو اسلام کو عطا ہوئی ہے اس میں کبھی کوئی فرق آنے والا نہیں۔ یہ اسلام کی ایک ابدی صفت ہے نہ کہ کوئی وقتی صفت۔

قرآن میں اس حقیقت کو پیغمبر اسلام کی نسبت سے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ــــــ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ وہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے، اور اللہ اس پر نگراں ہونے کے لئے کافی ہے۔ (الفتح ۲۸) خدا کا یہ فیصلہ اس حد تک حتمی ہے کہ قرآن کے مطابق، اسلام کے مخالفین اگر اس کے خلاف کوئی شر کھڑا کریں تو وہ شر بھی اسلام کے لئے خیر بن جائے گا (النور ۱۱)

اسلام کے اس مستقبل کو یقینی بنانے کے لئے خدا نے تاریخ انسانی کو ایک ایسے رخ پر ڈال دیا کہ وہ ہمیشہ وہی کورس اختیار کرے جو اسلام کی موافقت میں جانے والا ہو۔ **وکفی باللہ شھیدا** (الفتح ۲۸) کا مطلب یہی ہے۔ حتی کہ اس معاملہ کو یقینی بنانے کے لئے خدا نے یہ غیر معمولی فیصلہ فرما دیا کہ نہ صرف مسلم بلکہ غیر مسلم بھی اس موافقِ اسلام تاریخی عمل (Historical Process) میں اپنا مثبت حصہ ادا کرتے رہیں۔ یہ حقیقت صحیح البخاری کی ایک روایت میں اس طرح آئی ہے: **ان اللہ لیؤید ھذا الدین بالرجل الفاجر** (فتح الباری ۶/۲۰۸)

اسلام کی یہ صفت کوئی پراسرار چیز نہیں۔اس کو معلوم اسباب کے تحت سمجھا جاسکتا ہے۔یہ اسلام کا ایک محفوظ دین ہونا ہے۔اسلام کے محفوظ مذہب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ عین حقائق فطرت کے مطابق ہے۔اسلام کا حقائق فطرت کے مطابق ہونا اس کے اندر یہ خصوصیت پیدا کرتا ہے کہ وہ ہر زمانہ میں اپنی برتر صداقت کو باقی رکھے۔

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں بعد کے زمانے میں بگاڑ آ گیا۔اس بگاڑ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان مذاہب نے حقائق فطرت کے ساتھ اپنی مطابقت کھودی۔اور نتیجۃً وہ صرف وقتی صداقت بن کر رہ گئے نہ کہ ابدی صداقت۔اس کے برعکس اسلام اپنی اصل ابتدائی حالت پر باقی ہے۔اس لئے حقائق فطرت کے ساتھ اس کی مطابقت بھی باقی ہے۔اسلام کی یہی امتیازی صفت ہے جس نے اس کے اندر ابدیت کی قدر (eternal value) پیدا کردی۔اپنی اس صفت کی بنا پر اسلام اسی طرح ابدی صداقت بن گیا جس طرح فطرت کے قوانین ابدی صداقت بنے ہوئے ہیں۔

اسلام کے حق میں خدا کا یہ فیصلہ پچھلے چودہ سو سال کے درمیان بار بار واقعہ بنتا رہا ہے۔یہاں مثال کے طور پر اس کے چند تاریخی حوالے پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ اسلام ۶۱۰ عیسوی میں مکہ میں شروع ہوا جب کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی بار وحی نازل ہوئی۔اس وقت اسلام عددی اعتبار سے ایک فی دنیا کی حیثیت رکھتا تھا۔آج اہل اسلام کی تعداد ساری دنیا میں ایک بلین سے بھی زیادہ ہے۔پہلے دور میں اسلام کو جو چیلنج پیش آیا وہ اتنا بڑا تھا کہ اس کو انٹرنیشنل چیلنج کہا جاسکتا ہے۔ایک طرف عرب کے تمام قبائل اسلام کو آغاز ہی میں مٹا دینے پر تل گئے۔دوسری طرف عرب کے باہر اس وقت کی دنیا کے دو سب سے بڑے ایمپائر، رومن ایمپائر اور ساسانی ایمپائر اسلام کے دشمن بن گئے۔

مگر تاریخ بتاتی ہے کہ صرف ربع صدی کے اندر پورے عرب کو اسلامائز کرلیا گیا اور اس کے بعد اگلی ربع صدی میں اسلام رومن ایمپائر اور ساسانی ایمپائر کو ہمیشہ کے لئے توڑ کر ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصہ میں پھیل گیا۔یہ واقعہ اتنا زیادہ انوکھا تھا کہ ایک غیر مسلم مورخ نے

اس کا اعتراف ان غیر معمولی الفاظ میں کیا ہے کہ:

The expansion of Islam was the most miraculous of all miracles.

اسلام کی تیز رفتار توسیع تمام معجزوں سے زیادہ بڑا معجزہ تھا۔

۲۔ دوسری مثال اس عظیم پولیٹیکل چیلنج کی ہے جو منگول قبائل کی طرف سے پیش آیا۔ تیرہویں صدی عیسوی میں وہ طوفان کی طرح اٹھے۔ انھوں نے بغداد کی خلافت کو تباہ کر دیا۔ انھوں نے سمرقند سے لے کر حلب تک تمام مسجدوں کو ڈھا دیا۔ ان کا یہ غلبہ اتنا زبردست تھا کہ کچھ لوگ یہ کہنے لگے کہ اگر تم یہ سنو کہ تاتاری شکست کھا گئے تو اس پر یقین نہ کرنا (**اذا قیل لک أن التتر انھزموا فلا تصدق**)۔

اس وقت اسلام کی نظریاتی طاقت ظاہر ہوئی۔ مسلمان مرد اور مسلمان عورتوں نے اٹھ کر تاتاریوں کے درمیان خاموش دعوتی کام شروع کر دیا۔ انھوں نے تلوار کے چیلنج کا مقابلہ اسلام کی نظریاتی طاقت سے کیا، اس کا معجزاتی نتیجہ نکلا۔ پچاس سال سے بھی کم مدت میں پوری تصویر بدل گئی۔ منگول کی اکثریت اسلام کے دائرہ میں داخل ہوگئی۔ قرآن کے یہ الفاظ تاریخ بن گئے کہ: **فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کأنہ ولی حمیم** (۴۱:۳۴)

ایک غیر مسلم مورخ نے اس واقعہ کو A dazzling victory for the faith of Mohammad کا نام دیا ہے۔ وہ مزید ریمارک دیتا ہے کہ:

The religion of muslims had conquered where there arms had failed.

مسلمانوں کے مذہب نے وہاں فتح حاصل کر لی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہو گئے تھے۔

ایک اور غیر مسلم مورخ نے اس واقعہ کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ ــــــ فاتح نے مفتوح کے مذہب کو قبول کر لیا:

The conquerors have accepted the religion of the conquered.

۳۔ اسلام کے خلاف تیسرا بڑا چیلنج وہ تھا جس کو نظریاتی چیلنج (آئیڈیالوجیکل چیلنج) کہا جا سکتا

ہے۔ یہ وہ چیلنج ہے جو کمیونزم کی طرف سے پیش آیا۔ کمیونزم (اشتراکیت) انیسویں صدی کے نصف آخر میں یورپ سے ابھرا اور تقریباً سو سال تک پوری دنیا میں لوگوں کے ذہنوں پر چھایا رہا۔ ۱۹۱۷ میں روسی اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد جب سوویت یونین بنا تو اس نے عالمی سپر پاور کی حیثیت حاصل کر لی۔ وہ بظاہر ناقابل شکست نظریہ بن گیا۔

مگر **واللہ غالب علی أمرہ** (یوسف ۲۱) کے مطابق خدا کا فیصلہ ظاہر ہوا۔ اور ۱۹۹۱ میں سوویت ایمپائر ہاؤس آف کارڈس (تاش کے پتوں کے محل) کی طرح ڈھ پڑا۔ اس طرح کمیونسٹ ایمپائر کا آخری انجام صرف یہ ہوا کہ وہ عالمی سطح پر ایک ایسا نظریاتی خلا (ideological vacuum) چھوڑے جس کو دوبارہ صرف اسلام ہی پر کر سکتا ہو۔

۴۔ اسلام کے خلاف چوتھا چیلنج جدید سائنس کے ظہور کے بعد پیش آیا۔ انیسویں صدی کے نصف ثانی میں جب سائنسی دریافتیں بڑھیں اور فطرت کے چھپے ہوئے قوانین معلوم ہوئے تو جدید ملحدین نے یہ کہہ کر خدا کا انکار کر دیا کہ کائنات کی توجیہ کے نام پر خدا کو مانا جاتا تھا۔ اب ہم نے فطرت کا قانون دریافت کر لیا ہے، اس لئے اب خدا کو ماننے کی ضرورت نہیں۔ جولین ہکسلے (۱۸۸۷۔۱۹۷۵) نے جدید الحاد کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا کہ واقعات اگر فطری اسباب کے تحت ظہور میں آتے ہیں تو وہ فوق الفطری اسباب کا نتیجہ نہیں ہو سکتے:

"If events are due to natural causes, they are not due to supernatural causes."

اسلام کے مذہبی سسٹم کی پوری بنیاد ایک خدا کے تصور پر قائم ہے۔ اس لئے الحاد کا یہ جدید ایڈیشن اسلام کے خلاف بظاہر زبردست چیلنج تھا۔ لیکن دوبارہ خدا کا فیصلہ تاریخ میں ظاہر ہوا۔ خود مغربی دنیا میں ٹاپ کے سائنس داں اس متھ کو توڑنے کے لئے کھڑے ہو گئے، مثلاً سر جیمس جینس (۱۹۴۶۔۱۹۷۷) اور سر آرتھر اڈنگٹن (۱۹۸۲۔۱۹۴۴) وغیرہ۔

ان سائنس دانوں نے سائنسی دلائل کے ذریعہ اس حقیقت کو بتایا کہ جدید ملحدین کی یہ بات

محض ایک مغالطہ ہے کیوں کہ خدا کی نسبت سے اصل مسئلہ توجیہ کا ہے جب کہ نیچر محض ایک واقعہ ہے نہ کہ کوئی توجیہ:

Nature is a fact, not an explanation.

انھوں نے دلائل سے ثابت کیا کہ نیچر مخلوق ہے، وہ خالق نہیں۔ نیچر توجیہ نہیں کرتی وہ خود اپنے لئے توجیہہ کی محتاج ہے:

Nature does not explain, she herself is in need of an explanation

۵۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے لئے فکری اور نظریاتی غلبہ کو ابدی طور پر مقدر کر دیا گیا ہے۔ اسلام کے خلاف ہر چیلنج opportunity in disguise ہے۔ قرآن میں اس حقیقت کو ان لفظوں میں بیان کی گیا ہے کہ ہر عسر کے ساتھ یسر ہے (الانشراح)۔ گویا اسلام کو خدا نے ایک ایسی ناقابل تسخیر طاقت بنا دیا ہے جو اپنے ہر مائنس کو پلس میں تبدیل کر سکے۔ اس حقیقت کو ایک برٹش مورخ پروفیسر کلٹ نے پیغمبر اسلام کے ریفرینس میں اس طرح بیان کیا:

He faced adversity with the determination to wring success out of failure.

انھوں نے مشکلات کا مقابلہ اس عزم کے ساتھ کیا کہ وہ ناکامی سے کامیابی کو نچوڑیں۔

ایک کتاب

راج موہن گاندھی مشہور ہندستانی اسکالر ہیں۔ ان کی ایک کتاب ۱۹۹۹ میں پنگوئن بکس نے شائع کی ہے۔ ۴۶۰ صفحہ کی اس کتاب کا نام ''انتقام اور مصالحت'' (Revenge and Reconciliation) ہے۔ کتاب میں جنوبی ایشیا کی تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں اسلام کی تاریخ بھی شامل ہے۔

اس کتاب میں مسلم حکمرانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ گیارہویں صدی میں مسلم حکمراں اسلام کا جھنڈا لے کر ہندستان میں داخل ہوئے۔ راستہ میں جو ملا اس کو انھوں نے قتل کر دیا، بے شمار بتوں کو توڑ ڈالا، ہیرے جواہرات کو لوٹا۔ ان کے ہاتھ سے تلوار کبھی جدا نہ ہوتی تھی (صفحہ ۶۸)۔ کتاب میں کثرت سے اس طرح کی باتیں درج کی گئی ہیں جب کہ ان کا کوئی مستند تاریخی حوالہ موجود نہیں۔ اس سلسلہ میں مصنف کی دلیل کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

'ہر مسلماں رگ باطل کے لئے نشتر تھا'۔ یہ بات خدا کی طرف سے اقبال نے اپنی نظم جواب شکوہ میں کہی ہے، جو کہ جنوبی ایشیا کے سب سے مشہور جدید مسلم شاعر تھے۔ خود ساختہ مذہبی فریضہ یا دعوت حق کے معاملہ میں ان کا ردعمل متشددانہ تھا، قول اور عمل دونوں اعتبار سے:

"To every vein of falsehood, every Muslim was a knife". This is God speaking in *Jawab-e-Shikwa* ('Reply to the Complaint'), composed by one of south Asia's most famous modern poet, Iqbal. To a presumed religious duty or the call of truth, the response, whether in deed or verse, was violent. (p. 68).

مذکورہ کتاب ایک تاریخی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ اس میں اقبال کے شعر کا حوالہ نہایت عجیب

ہے۔کسی تاریخی بیان کو مستند تاریخ پر مبنی ہونا چاہئے نہ کہ کسی شاعر کے شعر پر۔اقبال کا مذکورہ مصرعہ یقینی طور پر ایک شاعرانہ تخیل ہے، اس کا اسلام کی حقیقی تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔لیکن راج موہن گاندھی نے اس شعر کی بنیاد پر تاریخ کے بارے میں ایک سنگین نظریہ قائم کرلیا۔ یہ بات علمی اعتبار سے سخت قابل اعتراض ہے۔تاہم یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس غلط تصویر کشی کے زیادہ بڑے ذمہ دار اقبال ہیں یا راج موہن گاندھی۔

کچھ مسلم بادشاہوں نے اپنے سیاسی مقصد کے لئے بعض سخت کارروائیاں ضرور کی ہیں مگر ان کا جنرلائزیشن یقینی طور پر درست نہیں۔ اس معاملہ میں مصنف کے خلاف بدگمانی اس وقت کم ہو جاتی ہے جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اگر چہ مسلم بادشاہوں کے رول کے بارے میں سخت قسم کے منفی تاثر کا اظہار کیا ہے۔تاہم انھوں نے مسلم صوفیاء کے مثبت رول کو بہت زیادہ سراہا ہے۔حتی کہ صوفیاء کا یہ کارنامہ بھی انھیں قابل اعتراض نظر نہیں آتا کہ انھوں نے لاکھوں ہندوؤں کو مسلمان بنایا (صفحہ ۷۵)

مصنف کے بارے میں تعصب کا شبہہ اس وقت اور کم ہو جاتا ہے جب ہم کتاب کا وہ حصہ پڑھتے ہیں جس میں ہندو عہد کا ذکر ہے۔ ہندو عہد کے بارے میں انھوں نے اس سے بھی زیادہ سخت تاثرات کا اظہار کیا ہے۔مثلاً وہ مہابھارت کے عہد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: مہابھارت کے زمانہ میں انتقامی کارروائیاں عام تھیں اور عفو و درگذر کی حیثیت اتفاقی تھی۔ کہنے کے لئے اگر چہ عفو و درگذر کی بات کہی جاتی تھی مگر عمل زیادہ تر انتقامی ہوتا تھا:

> In the Mahabharta, revenge is a fact, reconciliation a fancy; forgiveness is preached, vengeance practised. (p. 16)

کسی کتاب کا معاملہ ہو یا کسی تاریخ کا معاملہ، کوئی رائے قائم کرنے کے لئے ہمیشہ اس کے پورے مجموعہ کو دیکھنا پڑتا ہے۔کسی جزء کو دیکھ کر رائے قائم کرنا یا اس کو جنرلائز کر دینا علم کے خلاف بھی ہے اور دیانت داری کے خلاف بھی۔

اس سلسلہ میں ایک اور قابل اعتراض بات علامہ اقبال کے اردو شعر کا انگریزی ترجمہ ہے۔ اقبال کے شعر کے الفاظ یہ تھے: ہر مسلماں رگ باطل کے لئے نشتر تھا۔ اس شعر میں نشتر کے لفظ کا انگریزی ترجمہ نائف (knife) کیا گیا ہے جو کہ درست نہیں۔ یہ ترجمہ مشہور انگریزی رائٹر مسٹر خوشونت سنگھ نے کیا ہے۔ خوشونت سنگھ انگریزی کے اچھے ادیب ہونے کے ساتھ اردو زبان سے بھی واقف ہیں۔ مگر یہ سمجھنا مشکل ہے کہ انھوں نے اس معاملہ میں یہ غلطی کیوں کی۔

اقبال کے شعر میں جو لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ 'نشتر' ہے۔ اس کا ترجمہ مسٹر خوشونت سنگھ نے نائف کیا ہے جب کہ دونوں ایک دوسرے سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ نائف کا لفظ انگریزی میں اس کاٹنے والے آلہ کے لئے بولا جاتا ہے جس کے لئے اردو میں چھری یا چاقو کا لفظ استعمال ہوتا ہے، مگر نشتر اس سے مختلف چیز ہے۔ نشتر کا لفظ اردو یا فارسی میں جراحی آلہ (surgical knife) کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ نشتر کے لئے انگریزی میں صحیح الفاظ یہ ہیں:

scalpel, lancet, fleam.

اقبال کے اصل الفاظ کے مطابق، ان کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان رگ باطل کے لئے جراحی آلہ تھا۔ لیکن مسٹر خوشونت سنگھ کے ترجمہ کے مطابق اس کا مفہوم یہ بن گیا کہ: ہر مسلمان رگ باطل کے لئے ایک چھری تھا۔

اقبال کے شعر کو میں تاریخی اعتبار سے درست نہیں سمجھتا۔ اسلام کی پوری تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہر مسلمان باطل کی رگ کے لئے نشتر بنا ہوا ہو۔ باطل کے مقابلہ میں مسلمان کا کام پرامن دعوت ہے نہ کہ جراہی نشتر زنی۔ لیکن ان کے شعر کا مذکورہ انگریزی ترجمہ کرنے والے مترجم بھی یکساں طور پر غلط ہیں۔ اقبال کا کلام اگر خلاف تاریخ ہے تو انگریزی مترجم کا ترجمہ خلاف دیانت۔

چتر کوٹ کا سفر

۲۹ دسمبر ۱۹۹۵ کو دہلی سے چتر کوٹ (مدھیہ پردیش) کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ سفر اکھل بھارتیہ رچنا تمک سماج کی دعوت پر ہوا۔ اس کے تحت ہر سال کسی مقام پر آل انڈیا سمّیلن کیا جاتا ہے۔ اس سال ۳۰۔۳۱ دسمبر ۱۹۹۵ کو یہ سمیلن مدھیہ پردیش کے تاریخی قصبہ چتر کوٹ میں ہوا۔

دہلی سے ''مہا کوشل اکسپریس'' کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ پہلا تجربہ ہی حوصلہ شکن تھا۔ ٹرین ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہو کر روانہ ہوئی۔ یہ ٹرین نام کے اعتبار سے ''مہا'' تھی مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ غیر مہا ثابت ہوئی۔ یہ برصغیر ہند کا خاص مزاج ہے۔ یہاں ہر آدمی نام کے اعتبار سے اپنے کو بڑا ظاہر کرتا ہے، حالانکہ اس کا کام حقیقۃً بہت چھوٹا ہوتا ہے۔

میرے سامنے کی برتھ پر ایک تبّتی بدھسٹ تھے۔ ان کا نام پروفیسر سمدھونی رنپوچے (Prof. Samdhony Rinpoche) تھا، وہ بنارس میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بدھزم کے بارے میں کئی باتیں بتائیں۔

سوالات کے دوران انھوں نے بتایا کہ گوتم بدھ کے بارے میں یہ ثابت نہیں ہے کہ وہ کون سی زبان بولتے تھے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ پالی زبان میں انھوں نے اپدیش دیا۔ مگر تاریخی طور پر یہ ثابت نہیں۔ بدھزم پر جتنی بھی قدیم کتابیں ہیں وہ سب گوتم بدھ کے انتقال کے بعد تحریر کی گئیں۔ خود گوتم بدھ کے زمانے میں لکھی ہوئی کوئی تحریر آج موجود نہیں۔

۲۰ سال کی عمر میں رنپوچے جی کو تبت سے بھاگنا پڑا تھا۔ اب وہ ہندستان میں پناہ گزیں کے طور پر رہتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ چین کو تبت سے کیوں اتنی زیادہ دلچسپی ہے۔ انھوں نے کہا کہ چین وشوشکتی بننا چاہتا ہے، اور وہ تبت کے بغیر ایسا نہیں بن سکتا۔ ان کے نزدیک، چین کی نظر انڈیا پر ہے۔ اور تبت کو وہ انڈیا کا دروازہ سمجھتا ہے۔ چین کا یہ خیال ہے کہ وشو کو مکتی دلانے کے لئے اسے وشو پر قبضہ کرنا ہوگا۔ اس کے لئے وہ انڈیا پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔

انھوں نے انڈین اکسپریس ۲۷ دسمبر ۱۹۹۵ میں چھپا ہوا ایک لیٹر دکھایا۔ اس کے لکھنے والے میجر جنرل وی کے مدھوک (ریٹائرڈ) تھے اور اس کا عنوان تھا:

Chinese threat from Tibet

اس میں بتایا گیا تھا کہ چین انڈیا کی سرحد پر میزائلیں نصب کر رہا ہے اور ہمارے ملک کو چین کی طرف سے زبردست خطرہ ہے۔ اس لئے کم سے کم یہ ہونا چاہئے کہ چین اور انڈیا کے درمیان ایٹمی ہتھیاروں کے بارہ میں عدم آغاز کا ایک معاہدہ (no-first-use treaty) کر لیا جائے۔ اس وقت ہندستان میں ایک لاکھ ۳۰ ہزار (1,30,000) تبتی بطور پناہ گزیں مقیم ہیں۔

ٹرین میں ایک اور خاص آدمی سے ملاقات ہوئی۔ ان کا نام ایشور بھائی پٹیل تھا۔ وہ احمد آباد کے سابرمتی آشرم میں رہتے ہیں۔ وہ نیشنل کمیشن فار صفائی کرم چاری کے اہم ممبر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ انھوں نے مہاتما گاندھی سے ایک خاص سبق لیا۔ وہ یہ کہ ''چھوٹا کام لے کر چلو'' چنانچہ اس سلسلہ میں انھوں نے ۳۰ سالہ ریسرچ کے بعد اس قسم کے بہت سے کام کئے ہیں۔

مثلاً انھوں نے یہ کہا کہ پانی کثرت استعمال کی بنا پر دن بدن نیچے چلا جا رہا ہے۔ انسان پانی کی سطح کو اوپر نہیں لا سکتا۔ البتہ وہ پانی کے استعمال کو کم کر سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ایسے طریقے ایجاد کئے جن کے ذریعہ پانی کے استعمال کو کم کیا جا سکے۔ انھوں نے بتایا کہ ٹوائلٹ کے عام فلش میں ڈھائی لیٹر پانی ایک بار میں خرچ ہوتا ہے۔ اب انھوں نے ایسا فلش تیار کیا ہے جس میں ایک بار میں صرف ڈیڑھ لیٹر پانی خرچ ہوگا۔

اسی طرح انھوں نے دیہاتوں میں استعمال کے لئے ایسے چولھے تیار کئے ہیں جن میں لکڑی کا خرچ ۲۵ فی صد تک کم ہو گیا ہے۔ مزید یہ کہ اس کا دھواں اوپر چلا جاتا ہے اس لئے گھر کا لا نہیں ہوتا، اور صحت کو نقصان نہیں پہنچتا۔ اس طرح کے کئی کام انھوں نے کئے ہیں جو کہنے میں تو چھوٹے ہیں مگر حقیقت میں بہت بڑے۔

میرے سامنے کی برتھ پر ایک صاحب انگریزی ناول پڑھ رہے تھے۔ یہ ناول باریک ٹائپ

میں ۱۲۳۶ صفحات پر مشتمل تھا۔اس کا نام اس طرح تھا:

James Clavell's GAI-JIN, A Novel of Japan

اس کے آغاز میں بتایا گیا تھا کہ گائی جن کا مطلب خارجی(foreigner) ہے۔وہ جاپان کے بعض تاریخی پہلوؤں کا افسانوی بیان تھا۔تاہم اس میں یہ صراحت کی گئی تھی کہ یہ تاریخ نہیں ہے بلکہ فکشن ہے:

It is not history but fiction.

میں نے سوچا کہ مجھے اگر اس طرح کا ضخیم افسانہ پڑھنے کو کہا جائے تو وہ میرے لئے ایک سزا کے برابر ہوگا۔لیکن لوگ ایسے ضخیم افسانوں کو مہنگے داموں میں خریدتے ہیں اور انھیں دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ایک انسان اور دوسرے انسان میں کتنا زیادہ فرق ہے۔اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ میں علم کے لئے پڑھتا ہوں اور لوگ تفریح کے لئے۔

''جہاز ایک بار لیٹ ہوتا ہے،ٹرین بار بار''اس کا تجربہ مجھے اس سفر میں ہوا۔دہلی سے جب ہماری ٹرین لیٹ ہوکر چلی تو درمیان میں وہ بار بار مزید لیٹ ہوتی رہی۔کسی دوسری ٹرین کو گزارنے کے لئے کئی بار ہماری ٹرین درمیانی اسٹیشنوں پر کھڑی کردی گئی۔ ہوائی جہاز میں یہ مسئلہ نہیں۔ایک بار جب وہ ہوائی اڈہ سے روانہ ہوجائے تو اس کے بعد وہ درمیان میں لیٹ نہیں ہوسکتا۔اس کے بعد وہ اپنی منزل پر ہی پہنچ کر رکے گا۔

۱۲۷ کیلومیٹر کا سفر طے کرکے ہماری ٹرین ۳۰ دسمبر ۱۹۹۵ کی صبح کو چترکوٹ پہنچی۔اس وقت گھڑی میں ساڑھے چھ بج رہے تھے۔جب کہ اس کا اصل وقت ساڑھے چار بجے صبح کا ہے۔میرے ساتھی پروفیسر سمدھونی رن پوچے نے کہا کہ''کبھی لیٹ ہونا اچھا ہوتا ہے''۔ان کا مطلب یہ تھا کہ اگر ٹرین ٹھیک وقت پر آتی تو ابھی یہاں اندھیرا ہوتا۔دو گھنٹہ لیٹ ہونے کی وجہ سے اب اجالا ہو چکا ہے۔اور ہم لوگ اطمینان کے ساتھ اپنی قیام گاہ پر جاسکتے ہیں۔

چترکوٹ یوپی اور مدھیہ پردیش کی سرحد پر ہے۔صرف ایک دریا (مندا گنی) دونوں کو الگ کرتا ہے۔ریلوے اسٹیشن یوپی کے علاقہ میں واقع ہے۔جلسہ کے منتظمین اسٹیشن پر

موجود تھے۔ ان کے ساتھ روانہ ہوکر ہم لوگ چترکوٹ کے گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس میں پہنچے۔ یہاں میرا قیام کمرہ نمبر ۲۰۲ میں تھا۔

یہ گیسٹ ہاؤس کھلی جگہ پر واقع ہے۔ میرے کمرہ کے سامنے دور تک سرسبز مناظر ہیں۔ سورج کی روشنی، چڑیوں کی آوازیں، فطرت کا پھیلا ہوا ماحول، اس طرح کی ایک دنیا ہے جو میرے سامنے ہے۔ مجھے فطرت کی دنیا اتنی زیادہ پسند ہے کہ جی چاہتا ہے کہ وہیں جا کر بس جاؤں۔ مگر انسان ایک متمدن مخلوق ہے۔ جنگلوں میں مستقل رہائش اختیار کرنا اس کے لئے ممکن نہیں۔

گیسٹ ہاؤس میں لوگ میرے کمرہ میں آتے رہے، اور ان سے مفید اور معلوماتی گفتگوئیں ہوتی رہیں۔ مسٹر ڈی این بنرجی آئی اے ایس (رٹائرڈ سکریٹری) آجکل دہلی (کنگزوے کیمپ) میں واقع ہریجن سیوک سماج کے سکریٹری ہیں۔ (Tel. 7234851) انھوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ حضرت محمد صاحب نے عظیم طاقت حاصل کی۔ مگر ان کی شخصیت کا زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی طاقت کو ضبط و تحمل کے ساتھ استعمال کیا جس میں بعد کی نسلوں کے لئے سبق ہے:

Hazrat Mohammad weilded great power in himself but the greater part of him is that he exercised even more restraint in the exercise of his powers which should serve as a lesson to posterity.

D.N. Banerjee, Secretary, Harijan Sevak Sangh,

Kingsway Camp, Delhi-9 (Tel. 7234851)

جموں سے بھی کئی لوگ اس کانفرنس میں آئے ہیں۔ ان میں سے ایک ۶۰ سالہ خاتون پروفیسر کوشلیا والی ہیں۔ وہ جموں یونیورسٹی میں سنسکرت کی استاد ہیں۔ مہاکوشل اکسپریس جس سے میں چترکوٹ پہنچا اسی سے وہ بھی یہاں آئی ہیں۔

گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ میں پہلے سے آپ کو نہیں جانتی تھی۔ مگر ریلوے اسٹیشن پر آپ کو دیکھا تو مجھے آپ کی آنکھوں میں اور آپ کے چہرہ پر بڑی روحانیت نظر آئی۔ اس لئے میں آپ سے ملنے کے لئے آئی ہوں۔ انھوں نے درد کے ساتھ کہا: یہ گاندھی کے ہندستان کو کیا ہوا۔ آپ تو

تجربہ کار ہیں، کچھ راستہ نکالئے کہ پھر سے دیش پہلے جیسا ہو جائے۔

Prof. Koshelya Walli, 20, Rajendra Nagar, Canal Road Jammu
(Tawi) Pin-180001 Tel. (Res.) 543545

اکھل بھارتیہ رچنا تمک سماج کا تخیل مہاتما گاندھی کا دیا ہوا ہے۔ ونوبا بھاوے کا نام بھی اس میں شامل ہے۔ تاہم اس کو موجودہ نام کے ساتھ منظم انداز میں نرمل دیش پانڈے (ایم۔ پی) نے ۱۹۸۲ میں قائم کیا۔ نرمل دیش پانڈے (۶۲ سال) اس کی آل انڈیا صدر ہیں۔ سماجی خدمت میں مشغول ہونے کی وجہ سے انھوں نے شادی نہیں کی۔ وہ دہلی سے ایک ہندی پندرہ روزہ نتیہ نوتن کے نام سے نکالتی ہیں۔ چتر کوٹ میں اس کا شمارہ یکم جنوری ۱۹۹۵ مجھے دیکھنے کو ملا۔ اس میں ایک مضمون پروفیسر محمد ہاشم قریشی (جے این یو) کا تھا۔ اس کا عنوان تھا: اسلام اور اہنسا۔ اس کے چند جملے یہ تھے:

''اہنسا ویروں کا ابھوشن ہے، کایروں کا نہیں۔ اہنسا کے لئے دل بڑا اور انوبل اونچا ہونا چاہئے۔ ویر لڑتے ہیں سدھانتوں کے لئے، یدھ کے لئے نہیں۔ کمزوروں، عورتوں اور بچوں کی رکچھا کے لئے لڑنا بھی اہنسا کا ہی مارگ ہے۔ اتہ اوشیک ہے کہ اسلام کے سدھانتوں کے آدھار پر اس کے انویائیوں کو آنکا جانا چاہئے نہ کہ انویائیوں کے بیوہار کے آدھار پر اسلام کو۔ مسلمان کی کمزوری اسلام کی کمزوری نہیں ہے۔''

یہاں کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلم خاتون آئی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک جلگاؤں کی تھیں جن کا فیملی بیک گرونڈ کانگریسی تھا۔ دوسری خاتون دہلی سے تھیں جن کا فیملی بیک گراؤنڈ مسلم لیگ سے تعلق رکھتا تھا۔ دونوں میں گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک نے کہا کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان میں کوئی لیڈر شپ نہیں۔

میں نے کہا کہ میری رائے تھوڑی سی مختلف ہے۔ میرے نزدیک مسلمانوں کا اصل مسئلہ فقدان قیادت کا نہیں ہے بلکہ فقدان قبولیتِ قیادت کا ہے۔ مثال کے طور پر سرسید اور مولانا آزاد دونوں مسلمہ طور پر قیادت کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ مگر دونوں ہی کے معاصرین نے انھیں رد کر دیا۔ سرسید کو

انگریزوں کا ایجنٹ کہا گیا اور مولانا آزاد کو ہندوؤں کا ایجنٹ۔ پھر میں نے کہا کہ ہم زمانہ لوگوں کی قبولیت سے کوئی شخص لیڈر بنتا ہے نہ کہ مرحوم ہوجانے پر بعد کے لوگوں کی قصیدہ خوانی سے۔

۳۰ دسمبر کی دوپہر کو گیسٹ ہاؤس سے جلسہ کے لئے روانگی ہوئی۔ قریب پہنچے تو سڑک پر انسانوں کا ایک ہجوم نعرہ لگاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ سب دیہات سے آئے ہوئے عورت اور مرد تھے۔ ایک نعرہ کے الفاظ یہ تھے: ایک بنیں گے، نیک بنیں گے۔ اس کے علاوہ مہاتما گاندھی امر رہے، انقلاب زندہ باد کے نعرے بھی تھے۔ میں گیٹ کے پاس پہنچا تو مجھ سے کہا گیا کہ یہ لوگ آپ کا آشرواد چاہتے ہیں۔ انھیں اپنا آشرواد دیجئے۔ دستی مائکروفون پر میں نے مختصر طور پر کچھ اخلاقی باتیں کہیں اور ان کو دعائیں دیں۔

رام چرت مانس کے مصنف تلسی داس بھی چتر کوٹ آئے تھے۔ یہاں رہ کر انھوں نے اپنی کتاب تیار کی۔ ایک پنڈت جی نے بتایا کہ تلسی داس کے پاس اکبر بادشاہ کا پیغام آیا جس میں انھیں سیکری (راجدھانی) بلایا گیا تھا۔ تلسی داس خود نہیں گئے۔ انھوں نے ایک دوہا لکھ کر اکبر بادشاہ کو بھیج دیا:

آوت جات پنھیا ٹوٹی سنتن کو سیکریا سے کیا کام

یعنی تمہارے یہاں آنے جانے میں میرا چپل ٹوٹ جائے گا۔ میں ایک سنت ہوں سنت کو سیکری سے کیا مطلب۔

۳۰ دسمبر کی دوپہر کو جلسہ کا افتتاح تھا۔ رام لیلا میدان کے ایک وسیع پنڈال میں ملک کی چودہ ریاستوں سے آئے ہوئے پندرہ ہزار سے زیادہ آدمی جمع تھے۔ یہاں مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔

دیدی نرمل دیش پانڈے نے کہا کہ تلسی داس نے اپنی رام چرت مانس اسی چتر کوٹ میں بیٹھ کر لکھی تھی۔ اس کا ایک شعر یہ تھا:

چتر کوٹ کے گھاٹ پر بھئی سنتن کی بھیڑ تلسی داس چندن گھسیں تلک دینھ رگھوبیر

انھوں نے کہا کہ آج دوبارہ اسی چتر کوٹ میں سنتوں کی بھیڑ ہو رہی ہے۔ اجودھیا میں ایک

انسان نے جنم لیا، اور چتر کوٹ نے اس کو بھگوان بنا دیا۔ انھوں نے کہا کہ رام راجیہ وہ ہے جہاں کوئی کسی سے بیر نہ کرے، جہاں نفرت اور بیر ہو وہ راون راج ہے۔ انھوں نے کہا کہ ونوبا جی کہا کرتے تھے کہ ہندستان کا دماغ شہر میں ہے مگر ہندستان کا دل گاؤں میں ہے۔

ایک ہندو وِدّوان نے بتایا کہ دنیا میں اٹھارہ الگ الگ رامائن ہیں۔ سب سے پہلے والمیکی نے رامائن لکھی تھی۔ اس کے بعد کئی لوگوں نے رامائن لکھی۔ ان میں سے ایک تلسی داس کی رامائن ہے۔ اس طرح مجموعی طور پر اٹھارہ قسم کی رامائن ہیں۔ اگر والمیکی کی رامائن کو اصل قرار دیا جائے تو بقیہ سترہ رامائنیں اس کی تشریح قرار پائیں گی۔

یہاں نانا جی دیش مکھ سے بھی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے چتر کوٹ میں ایک یونیورسٹی (مہاتما گاندھی وشو ودیالیہ) بنائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے نوکریوں کی طرف دوڑتے ہیں۔ ہم اس یونیورسٹی میں یہ ذہن بنانا چاہتے ہیں کہ تعلیم نوکری کے لئے نہیں ہوتی۔ وہ انسان بنانے کے لئے ہوتی ہے۔

مسٹر پنچم لال، آئی اے ایس پٹنہ سے آئے تھے۔ (Tel. 235209) وہ نہایت ذہین اور جرأت مند آدمی ہیں۔ وہ وہاں کلکٹر ہیں۔ مگر وہ نہ کسی نیتا کی سنتے ہیں اور نہ حکومت کی۔ وہ وہی کرتے ہیں جو انصاف کا تقاضا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کا نباہ کیسے ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے نوکری کی پرواہ نہیں۔

وہ نہایت شستہ اردو بول رہے تھے۔ انھوں نے اقبال کے کئی شعر سنائے۔ مثلاً حسب ذیل شعر:

اہل دانش عام ہیں کم ہیں مگر اہل نظر کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا میرا ایاغ

سمیلن کے منچ پر میری نشست نرمل دیش پانڈے کے پاس تھی۔ درمیان میں انھوں نے منتظمین میں سے ایک شخص کو بلایا اور اس سے آہستہ سے کہا: دیکھئے، لوگ بہت منچ پر آ رہے ہیں۔ اپنے لوگوں کو اتار دیجئے۔ منچ اگرچہ بہت بڑا تھا لیکن باہر کے مہمان ہی بہت کافی تھے۔ اور اس کی گنجائش نہیں تھی کہ تنظیم کے لوگ بھی آ کر یہاں بیٹھیں۔ اس لئے انھوں نے ایسا کہا۔ میں نے سوچا

کہ یہی صحیح اخلاقی اصول ہے کہ اپنوں کے ساتھ سختی اور دوسروں کے ساتھ نرمی کی جائے۔ جو لوگ اس کے برعکس عمل کریں، وہ اپنوں کے لئے نرم اور دوسروں کے لئے سخت بن جائیں، وہ کبھی کوئی بڑا کام نہیں کر سکتے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ نیکی کی بات کرتے ہیں۔ بشر میں تو دو بٹے تین شر ہے۔ ایسی حالت میں تو شر ہی کو غلبہ رہے گا۔ میں نے کہا کہ اس کو اور ڈھنگ سے دیکھئے تو برعکس طور پر آپ کو نظر آئے گا کہ بشر میں شر بہت کم ہے۔ آپ بشر میں شین کا حرف نکال دیجئے۔ اس کے بعد وہ بر بن جائے گا۔ بر کا مطلب نیکی ہے۔ اب آپ کو دکھائی دے گا کہ بشر میں دو بٹے تین نیکی ہے۔

اس طرح کی لفظی باتیں محض لطیفہ ہوتی ہیں۔ ان کو دلیل نہیں کہا جا سکتا۔ دلیل وہ ہے جو حقیقی واقعات پر مبنی ہو، نہ کہ لفظی الٹ پھیر کی بنیاد پر۔

ایک صاحب نے کہا کہ مسلم مہیلائیں ساری دنیا میں اتنی زیادہ پچھڑی ہوئی ہیں، اس کا کارن کیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ سارا معاملہ آپ کے غلط جنرلائزیشن کا ہے۔ اگر آپ اس واقعہ کو لیں کہ دنیا میں تین مسلم دیشوں (پاکستان، بنگلہ دیش، ترکی) میں مسلم مہلائیں راج کر رہی ہیں اور اس کو جنرلائز کریں تو آپ کا سوال بدل جائے گا۔ اب آپ کہیں گے کہ مسلم مہلائیں ساری دنیا میں اتنی زیادہ آگے ہیں، اس کا کارن کیا ہے۔ مگر آپ نے کسی خاص محلّہ کی کچھ مسلم مہلاؤں کو لیا اور ان کو جنرلائز کر دیا تو آپ کو ایسا دکھائی دے رہا ہے کہ مسلم مہلائیں بہت زیادہ پچھڑی ہوئی ہیں۔

چترکوٹ میں ملک کے مختلف حصوں سے لوگ آئے تھے۔ ایک صاحب بنگال کے تھے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو گاندھی بھکت بتایا۔ میں نے کہا کہ بنگالی کے بارہ میں پہلا تصور یہ ہوتا ہے کہ وہ انقلابی ہوگا۔ وہ سبھاش چندر کو ماننے والا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ ایسا نہیں ہے۔ سبھاش چندر بوس ایک پرجوش آدمی تھے۔ مگر دیرپا انقلاب (sustainable revolution) کی طاقت صرف گاندھی کی آئیڈیالوجی میں تھی۔ میں نے کہا کہ مگر آزادی کے بعد کے ہندستان نے تو

بتایا ہے کہ خود گاندھی کی آئڈیالوجی بھی دیرپا نہیں تھی:

But the experience of post independent India has proved that even the Gandhian ideology was not sustainable.

پروفیسر رام چندر سنگھ (کاشی ودیاپیٹھ، بنارس) نے بہت سی باتیں بتائیں۔ انھوں نے کہا کہ میں اسلام کو بہت پسند کرتا ہوں۔ مگر میں پکا سہکاری ہوں۔ اسلام میں اگر قربانی نہ ہوتی تو میں اسلام کو سویکار کر لیتا۔ میں نے کہا کہ اسلام میں اگر قربانی کی تعلیم نہ ہوتی تو اسلام عالمی مذہب نہ ہوتا۔

چتر کوٹ ایک تاریخی جگہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ رام چندر جی کو جب چودہ سال کا بن باس ہوا تو اس کے بعد وہ یہاں آکر بارہ سال رہے تھے۔ میں نے ایک تعلیم یافتہ ہندو سے پوچھا کہ کیا یہاں اس زمانہ کا کوئی چنھ (نشان) ہے۔ انھوں نے کہا کہ قریب کے پہاڑ پر ان کے قدم کے نشان بتائے جاتے ہیں۔ مگر اس طرح کی چیزیں تاریخی طور پر قابل بحث ہیں:

But, historically, it is debatable.

ہندی اخبار امر اجالا کا شمارہ ۳۰ دسمبر ۱۹۹۵ دیکھا۔ اس کا اڈیٹوریل کا عنوان تھا: ویاپک تبادلے۔ درمیانی صفحہ کے مضمون کا عنوان تھا: اسلام اور راج نیتی۔ اس کے مضمون نگار آفتاب احمد تھے۔ میں نے سوچا کہ موجودہ زمانہ میں میڈیا کے ظہور نے ہمیں ایک نیا موقع دے دیا ہے۔ وہ یہ کہ ہم صرف ایک قابل اشاعت تحریر تیار کر سکیں۔ اور وہ اگلے دن اخباروں اور رسالوں میں چھپ کر لاکھوں لوگوں کے سامنے برائے مطالعہ موجود ہوگی۔

اجتماع گاہ میں ہندی زبان کا ایک ہینڈ بل تقسیم کیا گیا۔ اس کا عنوان تھا:

چتر کوٹ کا یہ سندیش ایک رہے گا بھارت دیش

اتحاد کو لفظوں میں ڈھالنا کتنا زیادہ آسان ہے، اور اس کو حقیقت کی شکل دینا کتنا زیادہ مشکل۔

ایک صاحب نے بتایا کہ جس زمانہ میں چودھری چرن سنگھ پرائم منسٹر تھے، وہ ان سے ملے۔ انھوں نے چودھری جی سے گئو ہتیا اور برہمنوں کے بارے میں کچھ بات کہی۔ چودھری چرن سنگھ نے سننے کے بعد کہا: آپ لوگ گائے اور برہمن کی بات تو کرتے ہیں، منش کی بات کبھی نہیں کرتے۔

بہت بڑے میدان میں اسٹیج بنایا گیا تھا۔ ہندستان بھر کے لوگ اس میں آئے ہوئے تھے۔ یہاں اسٹیج پر جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں سے ایک پھلہاری بابا تھے جو اجودھیا سے آئے تھے۔ وہ سچے سادھو ہیں۔ وہ بابری مسجد کو توڑ کر مندر بنانے کے سخت خلاف تھے۔ اب بھی مقامی طور پر زیادہ ہندو انھیں کے ساتھ ہیں۔ مگر باہر سے آئے ہوئے لوگ اور گورنمنٹ کی بے عملی کی وجہ سے ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کا حادثہ پیش آیا۔ انھوں نے حکومت کے اعلیٰ ذمہ داروں سے مل کر کہا کہ اگر آپ ساتھ دیں تو میں سیکڑوں سادھوؤں کو لے کر موجودہ مندر کو توڑ کر دوبارہ وہاں مسجد بنا دوں گا۔ مگر انھیں حکومت کا تعاون نہیں ملا۔ ان کا پتہ یہ ہے:

Phalahari Baba, Rajgopal Mandir, Ayodhya, Faizabad. (Tel.2042)

یہاں بہت سے لوگ ملے جنھوں نے اخبارات میں میرے مضامین پڑھے تھے یا مجھ کو ٹی وی پر دیکھا تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو الرسالہ کے باقاعدہ قاری تھے۔ انھیں میں سے ایک محمد اسماعیل حمدُ لے تھے۔ وہ جالنہ سے آئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ الرسالہ سے پہلے وہ الجمعیۃ ویکلی میں میرے مضامین پڑھا کرتے تھے۔

ہر تحریک اپنے وابستگان کے اندر کوئی خاص مزاج بناتی ہے۔ مثلاً سیاسی مزاج، احتجاجی مزاج، قومی مزاج وغیرہ۔ الرسالہ مشن کے سلسلہ میں میرا تجربہ ہے کہ جو لوگ پابندی سے اس کو پڑھتے ہیں ان کے اندر بھی ایک مخصوص مزاج بنتا ہے۔ یہ سنجیدگی اور حقیقت پسندی کا مزاج ہے۔ غالباً یہ صرف الرسالہ کی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے قارئین میں اس قسم کا مزاج بناتا ہے۔ کسی اور تحریک کے سلسلہ میں کم از کم میں نے ایسا تجربہ نہیں کیا۔ اسی طرح تنقید کو برداشت کرنے کا مزاج بھی الرسالہ والوں میں دوسروں سے زیادہ ہوتا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ قرآن میں یہ لکھا ہوا ہے کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے۔ یہ تو سائنس کی دریافت کے خلاف ہے۔ پھر آپ اس کی کیا توجیہ کریں گے۔

میں نے کہا کہ قرآن میں ایسا موجود ہی نہیں۔ آپ کی مراد غالباً اس آیت سے ہے جس کے

الفاظ ہیں کہ:**والشمس تجری لمستقر لها ذالک تقدیر العزیز العلیم** (یٰس) انھوں نے کہا کہ ہاں، میں نے کہا کہ اس آیت میں یہ کہاں لکھا ہوا ہے کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے۔اس میں جو بات ہے وہ یہ کہ سورج کا ایک مستقر یعنی اس کا ایک معین مدار ہے جس پر وہ گردش کرتا ہے۔اور یہ عین سائنٹفک بات ہے۔اس دنیا میں ذرہ سے لے کر بڑی بڑی کہکشاؤں تک کا نظام یہ ہے کہ ہر ایک کا ایک مرکز (مستقر) ہے، اور ہر چیز اپنے اپنے مرکز کے گرد گھوم رہی ہے۔زمین کا مستقر سورج ہے۔اور سورج کا مستقر کچھ اور ہے۔قرآن میں سورج کے خود اپنے مستقر کے گرد گھومنے کا ذکر ہے نہ کہ زمین کے گرد گھومنے کا۔

اس طرح کے اجتماعات کا سب سے بڑا فائدہ میرے نزدیک یہ ہے کہ اس میں بڑے پیمانہ پر لوگوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے۔ایک صاحب سے میں نے کہا کہ بالفرض اگر کوئی اور فائدہ نہ ہو تب بھی صرف ملنے کی خاطر (interaction for the sake of interaction) اس کو جاری رہنا چاہئے۔

جو لوگ صرف اپنے ہم قوم یا ہم مذاق لوگوں سے ملیں ان کی فکری ترقی یقینی طور پر رک جائے گی۔فکری ترقی کو مسلسل جاری رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر قسم کے لوگوں سے ملا جائے۔حتی کہ ان لوگوں سے بھی جو ہم سے الگ رائے رکھتے ہوں۔جو بظاہر ہمارے مخالف یا ہمارے دشمن ہوں۔ملنا جلنا ہمیشہ مفید ہوتا ہے، بشرطیکہ کھلے ذہن کے ساتھ ملاقات کی جائے۔

اس وقت رات کے ۸ بجے ہیں۔اور میں گیسٹ ہاؤس میں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔اچانک مجھے خیال آیا کہ جب میں کمرہ کا دروازہ کھول کر اس میں داخل ہوا تو اندر بالکل اندھیرا تھا۔پھر بجلی کی سوئچ دبانے کے بعد اجالا ہو گیا اور یہ ممکن ہو گیا کہ میں اس کے اندر لکھ پڑھ سکوں۔

بظاہر یہ ایک سادہ سی بات ہے جو ہر روز ہر آدمی کے ساتھ پیش آتی ہے۔تاہم اگر سوچئے تو اس میں بہت بڑی ایمانی خوراک موجود ہے۔اللہ تعالی نے اپنی مخصوص حکمت کے تحت دنیا کو اس طرح بنایا

ہے کہ یہاں بار بار اجالا اور اندھیرا آتا رہے۔ تاہم مختلف اسباب سے رات کے وقت بھی انسان کو روشنی کی ضرورت ہوسکتی ہے۔ اس کے لئے خدا نے مصنوعی روشنی کا امکان دنیا کے اندر رکھ دیا ہے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے ٹرین اور جہاز میں عمومی لائٹ بجھانے کے بعد بھی ایک نجی لائٹ ہوتی ہے جس کو محدود طور پر روشن کر کے کوئی شخص اپنی ضرورت پوری کر لیتا ہے۔ سورج کی عمومی روشنی کے ساتھ مصنوعی روشنی کا محدود انتظام واضح طور پر منصوبہ بندی کا ثبوت ہے۔ اور منصوبہ بندی ثابت ہونے کے بعد اپنے آپ منصوبہ ساز کا وجود ثابت ہو جاتا ہے۔

۳۰ دسمبر کو دوپہر کا کھانا میں نے کمرہ میں منگا لیا تھا۔ شام کا کھانا لوگوں کے ساتھ کھانے کے لئے ڈائننگ ہال میں چلا گیا۔ وہاں ہم لوگ ایک میز کے گرد نو آدمی تھے۔ لوگ مسلسل بول رہے تھے۔ مگر میں بالکل خاموش سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا۔ دیر تک مجھے اس طرح سکوت کی حالت میں دیکھنے کے بعد ایک تعلیم یافتہ ہندو خاتون نے کہا: ''مولانا صاحب اپنے میں رہتے ہیں، خدا کے ساتھ''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تاہم میرا حال یہ ہے کہ مجھے بولنے سے زیادہ چپ رہنا پسند ہے۔ چپ رہنے کا مطلب سوچنا یا ذکر و فکر ہے، اور سوچنا یا ذکر و فکر کرنا بلاشبہہ ایک عبادت ہے۔

ہال کے اندر ٹی وی چل رہا تھا۔ اس پر گانے کی آواز آرہی تھی۔ جموں سے آئے ہوئے ایک صاحب نے کہا کہ آجکل عجیب حال ہو گیا ہے۔ ہندستانی گانے ویسٹرن ٹیون پر آتے ہیں۔ یہ تو ہندستانی گانوں کو تباہ کر دے گا۔

اس قسم کی نقل مذہب میں بھی بڑے پیمانہ پر رائج ہے۔ لوگ اپنے مذہبی عمل کو خارجی شکلوں کے ساتھ ادا کر رہے ہیں۔

ایک صاحب (مسٹر جوشی) نے مسلم پرسنل لا میں ریفارم کی ضرورت بتاتے ہوئے کہا کہ قوانین کبھی مقدس نہیں ہوتے، اور نہ ابدی اور نا قابل تغیر ہوتے ہیں۔ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ کیوں کہ سماج کوئی جامد چیز نہیں۔ اور قوانین اس لئے بنائے جاتے ہیں کہ وہ اس بات کی ضمانت دیں کہ بدلتے

ہوئے سماج میں انصاف اور ہم آہنگی فراہم کرسکیں:

Laws are not sacrosanct, unchanging and eternal. They cannot be. Because society is not static. And laws are designed to ensure just and harmonious social relationship in a changing society.

میں نے کہا کہ آپ کی یہ بات قدیم قیاسی منطق پر مبنی ہے جواب علمی دنیا میں ختم ہوچکی ہے۔ آپ نے پیشگی طور پر فرض کرلیا کہ قوانین ہمیشہ قابل تغیر ہوتے ہیں، اس لئے اسلامی قانون کو بدلنا چاہئے۔ اس کے بجائے استدلال کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ پہلے اسلام کے قانون سے مثال دے کر یہ ثابت کریں کہ فلاں قانون فلاں متعین سبب کی بنا پر قابل تبدیلی ہوگیا ہے۔ اس کے بعد تبدیلی کا مطالبہ کریں۔ مگر آپ حقیقت کے بجائے مفروضہ کی بنیاد پر تبدیلی کا مطالبہ کررہے ہیں اور ایسا مطالبہ یقینی طور پر غیر علمی اور ناقابل قبول ہے۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو نے بتایا کہ ہمارے مولوی صاحب بچپن میں اپنے اشعار کے ذریعہ ہم کو جغرافیہ پڑھایا کرتے تھے۔ مثلاً انھوں نے سری لنکا کا جغرافیہ اس طرح ہمیں یاد کرایا تھا:

اک طرف لٹکا ہوا لنکا بہ شکل آم ہے

مجھے یاد آیا کہ اقبال احمد سہیل مرحوم نے اسی طرح کئی تاریخی کلمات موزوں کئے تھے۔ مثلاً محمود غزنوی کے داخلۂ ہندستان (۱۰۰۱) کے لئے: ادھر ادھر ڈنڈا، بیچ میں دوانڈا۔

۳۱ دسمبر کی صبح کو نماز فجر ادا کی۔ اس کے بعد گیسٹ ہاؤس کی لمبی بالکنی میں ٹہلنے لگا۔ اس وقت فضا میں کہر چھایا ہوا تھا۔ ہر چیز گہرے کہر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ قریب کے درخت بھی صاف دکھائی نہیں دیتے تھے۔ سورج نکلنے کے ساتھ فضا صاف ہونا شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ ہر چیز صاف دکھائی دینے لگی۔

میں نے سوچا کہ اسی طرح ایک اور کہر ہے جس نے موجودہ زمانہ میں تمام اعلیٰ حقیقتوں کو ذہنوں سے اوجھل کر دیا ہے۔ اس کو ذہنی کہر آلودگی (beffoging of mind) کہہ سکتے ہیں۔ یہ دوسرے قسم کا کہر پریس کے دور نے پیدا کیا ہے۔ لوگوں نے غلط قسم کی باتیں اور حقائق کی غلط تعبیرات اس طرح پھیلا دی ہیں کہ اب وہ انسانی ذہنوں پر پردہ بن کر چھا گئی ہیں۔ آدمی حقیقتوں کو ان کی صحیح

صورت میں دیکھ نہیں پاتا۔ ہر آدمی غلط سوچ کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔

میں نے سوچا کہ فضائی کہر کو تو سورج نے ختم کر دیا، یہاں تک کہ ماحول کی ہر چیز اپنی واقعی صورت میں دکھائی دینے لگی۔ مگر ذہنی کہر کو کون صاف کرے گا۔ پھر خیال آیا کہ قیامت کا دن اس کے لئے عظیم تر سورج کی مانند ہوگا۔ اس وقت تمام حقیقتیں اپنی اصلی صورت میں دکھائی دینے لگیں گی۔ کامیاب وہ ہے جو اس سے پہلے اپنی چشم بصیرت سے حقیقتوں کو دیکھ لے۔ جو آدمی حقیقتوں کو قیامت کا سورج نکلنے کے بعد دیکھے، اس کے لئے وہ دن حسرت اور محرومی کا دن ہوگا نہ کہ کامیابی کا دن۔

جلسہ کے منتظمین کا اندازہ تھا کہ موسم اچھا نہ ہونے کی وجہ سے شاید زیادہ آدمی نہ آسکیں۔ مگر ۳۱ دسمبر کو بیس ہزار سے زیادہ آدمی چتر کوٹ کے رام لیلا میدان میں جمع ہو چکے تھے۔ یہ تعداد راشن ٹکٹ کی بنیاد پر تھی۔ اس کے علاوہ بہت سے لوگ اور تھے جنھوں نے یہاں کھانا نہیں کھایا اس لئے انھوں نے ٹکٹ بھی نہیں لیا۔ ایک صاحب نے دور تک انسانوں کی بھیڑ کو دیکھ کر کہا کہ میرے خیال سے دو لاکھ آدمی ہوں گے۔ نظر کی بنیاد پر جو اندازے قائم کئے جاتے ہیں وہ اکثر غلط ہوتے ہیں۔

یہ لوگ ہندستان کے کونے کونے سے آئے تھے۔ بارش، جاڑے کا موسم، ٹرینوں اور بسوں کا صبر آزما سفر، کوئی چیز انھیں روک نہ سکی۔ بہت سے لوگ تو سیکڑوں میل دور سے بائیسکلوں کے ذریعہ سفر کر کے یہاں پہنچے تھے۔ جب کہ انھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہاں ان کے لئے کھانے اور ٹھہرنے کا کیا انتظام ہوگا۔

اس کے پیچھے موونگ فورس کیا ہے۔ یہ غالباً ایک ہی نفسیات ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں اور دوسرے گروہوں میں مشترک طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ اور وہ ہے تاریخ کا زور۔ اکھل بھارتیہ رچنا تمک سماج کی پشت پر گاندھی، ونوبا بھاوے اور جے پرکاش نرائن جیسے بڑے لوگوں کے نام شامل ہیں۔ لوگ اپنے انھیں ''اکابر'' کے نام پر ہر طرف سے دوڑے چلے آرہے ہیں۔ خدا یا حقیقت اعلیٰ کے لئے دوڑنے والے شاید نہ مسلمانوں میں ہیں اور نہ ہندوؤں میں۔

۳۱ دسمبر کو گیارہ بجے دوسرا سشن شروع ہوا۔ اس کا موضوع سرودھرم سمبھاؤ سمیلن تھا۔ سب سے پہلے ایک پارٹی نے مذہبی گیت گایا۔ اس کا ایک حصہ یہ تھا:

تری ذات پاک قرآن میں تری درس وید پران میں
گرو گرنتھ جی کے بکھان میں تو پرکاش اپنا دکھا رہا

پچھلے ۲۵ سال سے میں دنیا کے مختلف حصوں میں ہر مذہب کی کانفرنس میں شریک ہوتا رہا ہوں۔ میرا احساس یہ ہے کہ مذہبی ڈائلاگ کی راہ میں دو قسم کے مسائل ہیں۔ سامی مذاہب میں یہ مسئلہ ہے کہ ہر مذہبی گروہ اپنے ہی کو سچا سمجھتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں آرین مذاہب کا مسئلہ لوگوں کا یہ سمجھنا ہے کہ ہر مذہب سچا ہے۔ دونوں باتیں بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مگر ڈائلاگ کے عمل کو مؤثر طور پر جاری رکھنے کے لئے دونوں یکساں طور پر مسئلہ ہیں۔ پونے بارہ بجے ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ کی آواز آئی۔ معلوم ہوا کہ اتر پردیش کے راج پال موتی لال وورا آچکے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد کاروں کے قافلہ کے ساتھ وہ پنڈال میں داخل ہوئے۔

۳۱ دسمبر کے سرودھرم سمیلن میں پہلی تقریر مجھے کرنی تھی۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ اسلام کے بارہ میں آج بہت غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اسلام کو نفرت کا یا مار کاٹ کا مذہب سمجھ لیا گیا ہے۔ مگر یہ بالکل الٹی بات ہے۔ اسلام سرتاسر امن اور محبت کا مذہب ہے۔ اسلام کا مقصد آدمی کو مادی کے بجائے روحانی بنانا ہے۔ اسلام جب کسی کے دل میں اترتا ہے تو وہ آدمی کے جینے کی سطح کو بلند کر دیتا ہے۔ ایسا آدمی نفرت اور تشدد جیسی چیزوں سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ پھر وہ غیر انسانی کام کیسے کرے گا۔

میں نے مختلف حدیثیں سنائیں۔ اور رسول اللہ صل اللہ علیہ وسلم کے کچھ واقعات سنائے اور بتایا کہ آپ کا دل کس طرح ساری انسانیت کے لئے شفقت اور محبت سے بھرا ہوا تھا۔ آپ انسان کو ہر حال میں انسان کے روپ میں دیکھتے تھے، خواہ وہ اپنا ہو یا غیر۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام مذاہب محبت ہی کا سبق دیتے ہیں۔ اقبال نے درست کہا ہے:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

آخر میں میں نے کہا کہ خدا سے میری دعا ہے کہ وہ ہم سب کو انسانیت اور پیار کے ساتھ رہنے کی توفیق دے۔ کیوں کہ پیار سے بھرے ہوئے سینے ہی اس دیش کو آگے لے جائیں گے۔ شانتی کی بانی بولنے والے لوگ ہی کسی نئے مستقبل کی تعمیر کریں گے۔

آج مجمع کافی تھا۔ پنڈال میں ۲۵ ہزار سے زیادہ لوگ اکٹھا تھے۔ ان میں چند کو چھوڑ کر سبھی ہندو تھے۔ میں نے اسلام پر تقریر کی تو پوری کانفرنس میں سب سے زیادہ خاموشی چھائی رہی۔ لوگ انتہائی توجہ کے ساتھ میرا ایک ایک لفظ سنتے رہے۔ یو پی کے گورنر موتی لال وورانے آخر میں کہا: بہت اچھا لگا آپ کا بیان۔

میں نے سوچا کہ اس ملک میں اسلام کا پیغام پہنچانے کے لئے کتنے زیادہ مواقع تھے۔ مگر مسلم رہنماؤں نے صرف ان مواقع کو برباد کیا۔ انھوں نے برادران وطن سے مناظرہ بازی چھیڑ دی۔ بٹوارہ کی آندھی چلا کر دونوں فرقوں کو ایک دوسرے سے دور کیا۔ احتجاج اور حقوق طلبی کے ذریعہ فضا میں تلخی پیدا کرتے رہے۔ ایک کے بعد ایک ایسی تحریکیں اٹھائیں جو صرف نفرت اور تناؤ کو بڑھانے والی تھیں۔ ہمارے رہنماؤں نے کبھی بھی محبت اور خیر خواہی کے انداز میں کام نہیں کیا۔ انھوں نے اس ملک کے لوگوں کو مثبت انداز میں اسلام کا پیغام نہیں دیا۔ اس میں استثناء صرف صوفیاء کا ہے۔ جلسہ میں سبھی اخباروں کے نمائندے تھے۔ ہر اخبار میں میری تقریر کی رپورٹنگ ہوئی۔ روزنامہ نوکرم یگ (باندہ) یکم جنوری ۱۹۹۶ کا شمارہ راگھوندر سجان نے مجھے لا کر دیا۔ اس کا ایک پیراگراف یہ تھا:

''مولانا وحید الدین خاں نے کہا کہ سبھی دھرم میں محبت اور انسانیت کی باتیں ملتی ہیں۔ اسلام کو مسلمانوں سے نہیں بلکہ مسلمانوں کو اسلام کی کسوٹی پر جانچا جانا چاہئے''۔

اس جلسہ میں زیادہ تر دیہات کے لوگ آئے تھے۔ منتظمین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ اس کا مقصد دراصل عوام کو موبیلائز کرنا ہے۔ اس کے بہت سے سماجی اور اخلاقی فائدے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک جاہل عورت سے میں نے پوچھا کہ تم نے یہاں آکر کیا پایا۔ اس نے کہا کہ میں نے تو یہ پایا کہ ''ہندو مسلم سب ایک ہیں اور ہمیں ایک بن کر رہنا ہے'' اس طرح انھوں نے کہا کہ یہاں ہر ذات

کے لوگ اکٹھا بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ اس طرح چھوت چھات کا ذہن ختم ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں کے لوگ یہاں آ کر جب ہزاروں لوگوں کو دیکھتے ہیں تو ان کے اندر نیشنل اسپرٹ پیدا ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایک بہت بڑے پریوار کے ممبر ہیں۔ وغیرہ

باندہ کے ایک صاحب ایک تھیلی لائے تھے۔ انھوں نے اسے دیدی نرمل دیش پانڈے کو پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس میں بڑے بڑے پونجی پتیوں کی رقمیں نہیں ہیں۔ بلکہ غریب لوگوں کی محنت کے پیسے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جب ہم نے لوگوں کو اکٹھا کر کے کہا کہ ہمیں سرودھرم سمبھاؤ سمیلن کے لئے کچھ دان پیش کرنا ہے۔ تو سب سے پہلے چندہ دینے والا ایک فقیر تھا۔ اس دن اسے بھیک میں دو روپیہ ملے تھے۔ اس نے اپنی جھولی خالی کرتے ہوئے اپنی ساری پونجی ہمیں دے دی، ہم نے کہا کہ تم اس میں سے ایک روپیہ لے لو۔ اس نے کہا کہ نہیں۔ میں ایک دن بھوکا رہ جاؤں گا۔ دیش کے لئے یہ کوئی بڑی قربانی نہیں۔

بمبئی سے ایک معمر مسلم خاتون مسز لطیفہ قاضی بھی اس اجتماع میں آئی تھیں (Tel. 4922264) انھوں نے بتایا کہ ۱۰ سال پہلے میرے لڑکے ڈاکٹر قاضی سید محمد علی حیدرآباد میں ایم بی بی ایس کے طالب علم تھے۔ انھوں نے حیدرآباد میں آپ کی تقریر سنی۔ اس کو سن کر وہ رونے لگے۔ آپ نے اپنی تقریر میں بتایا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں سے صلح کرنے کے لئے کاغذ سے رسول اللہ کا لفظ مٹا دیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے یہ صاحبزادے اب نیویارک میں ایم ڈی کا کورس کر رہے ہیں۔ ان کا پختہ خیال ہو چکا ہے کہ اسلام امن کا مذہب ہے نہ کہ لڑنے بھڑنے کا مذہب۔

ایک صاحب نے کہا ''جب تک چناؤ کی راج نیتی نہیں آئی تھی دیش میں کوئی مت بھید نہیں تھا۔ ہندو اور مسلمان کے بیچ میں کوئی فرق نہیں تھا۔ الکشن کی راج نیتی نے سارا معاملہ بگاڑ دیا۔

اجودھیا سے آئے ہوئے سری مہنت رام نے کہا کہ مسلمانوں کے کچھ لیڈر جب نفرت کی بولی بولتے ہیں تو اس کے ردعمل میں فوراً ہندو فرقہ پرستوں کا سنگٹھن ہو جاتا ہے۔ ہم ہندو فرقہ پرستی کے

خلاف ہیں۔ ہم اس سے لڑ رہے ہیں۔ مگر مسلمانوں کے کچھ لیڈر، نفرت کی بولی بول کر ہمارا کام مشکل بنا دیتے ہیں۔

Shri Mahant Ram Kirpal Dass, Sanatan Mandir,
Ram Ghat, Ayodhya (Tel. 052876- 2137)

ایک مقرر نے بتایا کہ ونوبا بھاوے جی نے ''جے جگت'' کا نعرہ دیا تھا۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ دیش کا نعرہ چھوڑ کر سارے جگت کا نعرہ کیوں دے رہے ہیں۔ ونوبا جی نے جواب دیا کہ ہماری سوچ عالمی ہونا چاہئے، البتہ ہمارا عمل مقامی اعتبار سے ہونا چاہئے:

We have to think globally but we have to work locally.

اجودھیا سے پروفیسر وائی آر تر پاٹھی آئے تھے۔ انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہ کہا جاتا ہے کہ سارے مذہب ایک ہیں۔ مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی، اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کرسچین لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسان پاپ کے ساتھ پیدا ہوا ہے۔ دوسری طرف ہندو وید بتاتے ہیں کہ ہر آدمی پرماتما کا انش کے روپ میں پیدا ہوتا ہے۔ جب مذہبوں کے بیچ میں ایسے اختلافات ہیں تو یہ کہنا کیسے چل سکتا ہے کہ سب مذہب ایک ہیں۔

Prof. Y. R. Tripathi, Principal K. S. Saket Postgraduate College,
Ayodhya Faizabad, U.P. (Tel. 0527- 814203 (R.)) (05276- 2305 O.)

میں نے کہا کہ ''سارے مذاہب ایک ہیں'' صرف ایک خیالی فلسفہ ہے۔ وہ کوئی عملی بات نہیں۔ مذہبی اختلاف کا حل اختلاف کو برداشت کرنا ہے نہ کہ اختلاف کو مٹانا۔

بنارس ہندو یونیورسٹی کے ایک سابق ہندو استاد نے ۱۹۵۳ کا ایک واقعہ بتایا۔ ایک کانگریس مسلمان جنھوں نے آزادی کی جنگ میں اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا۔ آزادی کے بعد وہ لکھنؤ میں پنڈت گووند بلبھ پنت (چیف منسٹر) سے ملے۔ انھوں نے پنت جی سے کہا کہ میرے جاننے والے مجھ سے کہتے ہیں کہ تم کو آزادی سے کیا ملا۔ آپ مجھے کم سے کم ایم ایل سی بنا دیجئے۔ تاکہ میں اپنے لوگوں کو جواب دے سکوں۔ گووند بلبھ پنت نے مذکورہ مسلمان سے کہا کہ تم کو ایم ایل سی بنا کر ہم کیا کریں گے۔ ہم کو تو وہ آدمی چاہئے جو ہم کو مسلمانوں کا ووٹ دلائے۔ مذکورہ مسلمان نے کہا کہ پنت جی کے یہ الفاظ

سن کر مجھے ایسا لگا جیسے مجھے آسمان سے زمین پر پٹک دیا گیا ہو۔

موصوف نے کہا کہ میں خود ایک کانگریسی ہوں۔ مگر آزادی کے بعد کانگریسی لیڈروں نے بس ووٹ کو سب کچھ سمجھ لیا۔ یہاں تک کہ لیگیوں اور فرقہ پرستوں سے انھوں نے صرف اس لئے جوڑ پیدا کرلیا کہ وہ انھیں اپنے فرقہ کا ووٹ دلا سکیں گے۔

۳۱ دسمبر کی شام کو منچ پر نواح کے ایک بدھسٹ ڈاکٹر تاشی سامپھل (Tashi Samphel) سے ملاقات ہوئی۔ ان کی عمر ۴۲ سال ہے آج کل وہ سارناتھ کے تبت انسٹی ٹیوٹ میں استاد ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ اسلام میں جس طرح لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ بنیک اصول ہے۔ اسی طرح بدھ دھرم کا بنیادی اصول کیا ہے۔ انھوں نے منکسرانہ انداز میں کہا: سبھی اکشل کرموں کو نہیں کرنا، کشل کرموں کو کرنا۔ اور من کو قابو میں رکھنا۔

ایک صاحب (مسٹر لال) سے ملاقات ہوئی۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے، انھوں نے کہا کہ میں کمیونسٹ ہوں۔ اس طرح کمیونزم پر بات چل پڑی۔ پہلے نظریاتی گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ سوویت یونین سے کمیونزم کی ناکامی یہ ثابت کرتی ہے کہ مارکسی نظریہ صحیح نہ تھا۔ انھوں نے کہا کہ عمل کی ناکامی سے نظریہ کی غلطی ثابت نہیں ہوتی۔ میں نے کہا کہ یہاں مسئلہ سادہ طور پر عملی ناکامی کا نہیں ہے بلکہ ایک مفروضہ کے غلط ثابت ہونے کا ہے۔ مارکس نے کہا تھا کہ انسانی شعور کوئی مستقل چیز نہیں۔ پیداوار اور تبادلہ کا نظام انسانی شعور کی صورت گری کرتا ہے۔ سوویت یونین میں یہ نظام مکمل طور پر بدل دیا گیا۔ مگر انسانی شعور میں مطلق کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ دولت کی حرص، اقتدار پسندی، اغراض کا ٹکراؤ، سب بدستور پوری طرح جاری رہا۔

وہ بحث کرتے رہے۔ پھر میں نے موضوع بدل دیا۔ میں نے کہا کہ بالفرض اگر آپ کمیونزم کی نظریاتی غلطی نہ مانیں تو ایک اور بات تو خالص تاریخی ہے۔ اس کو تو بہر حال آپ کو ماننا پڑے گا۔ وہ یہ کہ کمیونسٹ نظام عملی طور پر چلنے والا (sustainable) نظام نہیں۔ اس کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ سوویت سسٹم کسی خارجی حملہ کے بغیر خود اپنی داخلی کمزوریوں کی بنا پر ٹوٹ گیا۔ جب کہ وہ نظام

جس کو مارکس نے سرمایہ دارانہ نظام کہا تھا، وہ رکاوٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مزید طاقت کے ساتھ چلا جارہا ہے۔ پھر جو نظام سرے سے قابل عمل ہی نہ ہو، اور اگر قابل عمل ہو تو اس وقت جب کہ بد ترین تشدد کے ذریعہ انسانی آزادی کا خاتمہ کردیا جائے۔ پھر ایسے نظام کی انسان کو کیا ضرورت۔

ایک ۶۰ سالہ مسلم خاتون سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے شادی نہیں کی ہے۔ انھوں نے ایم اے تک تعلیم حاصل کی ہے اور ایک یونیورسٹی میں ملازم ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ آپ کو کیا تنہائی (loneliness) کا احساس نہیں ہوتا، انھوں نے کہا کہ اب دو تین سال سے ہونے لگا ہے۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ سروس سے ریٹائر ہونے کے بعد یہ احساس اور زیادہ بڑھ جائے گا۔

میرا خیال ہے کہ کچھ عورتیں گھریلو زندگی کے جھنجھٹ سے بچنے کے لئے شادی نہیں کرتیں۔ جوانی کی عمر میں یہ ایک خوش نما بات دکھائی دیتی ہے۔ مگر جب عمر زیادہ ہوتی ہے تو ایسی زندگی سراپا مسئلہ بن جاتی ہے۔

یہاں تمام آنے والوں کو کھانا کھلایا جارہا تھا۔ اس لئے ان کی تعداد کا قطعی اندازہ کرنا ممکن تھا۔ ۳۱ دسمبر کو معلوم ہوا کہ آنے والوں کی تعداد ۲۰ ہزار سے زیادہ ہوچکی ہے۔ دور اور قریب سے کثیر تعداد میں مرد اور عورتیں وسیع پنڈال میں جمع تھے۔ اسٹیج سے اعلان کیا گیا کہ یہاں دیش کے کونے کونے سے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ کنیا کماری سے لے کر کشمیر تک کے لوگ یہاں جمع ہیں۔

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں ہی میں ایسا ہوتا ہے کہ لوگ جلسوں اور میلوں میں بھاری تعداد میں آتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح کے اجتماعات کے بارے میں میرا نظریہ یہ ہے کہ ان کی بہت زیادہ اہمیت نہیں ہوتی۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہر آدمی، خواہ وہ امیر ہو یا غریب، کسی نہ کسی وجہ سے ٹنشن میں رہتا ہے۔ آجکل چونکہ سفر کے ذرائع بڑھ گئے ہیں، اس بنا پر لوگوں کے لئے اپنے ٹنشن کو ریلیز کرنے کا یہ آسان طریقہ نظر آتا ہے کہ یہاں سے وہاں چلے جائیں۔ چنانچہ ایسا کوئی موقع سامنے آتے ہی لوگ اپنے گھروں سے نکل پڑتے ہیں۔ ان اجتماعات کی حیثیت زیادہ تر آؤٹنگ کی ہے۔ اپنے اپنے ذوق کے مطابق،

کوئی مذہبی آؤٹنگ کر رہا ہے، کوئی سیاسی آؤٹنگ، کوئی اور آؤٹنگ۔

مسٹر عبد المعبود ایم ایس سی (دہلی) سرونٹس آف پیپل آف انڈیا سے جڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہ سوسائٹی بہت سے رفاہی ادارے (اسپتال، معذوروں کا اسکول وغیرہ) چلاتی ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اس طرح کے سماجی خدمت کے ادارے ہندوؤں میں بہت زیادہ ہیں۔ جب کہ مسلمانوں میں ایسے ادارے نسبتاً بہت کم ہیں۔ اور جو ہیں وہ بھی اکثر خراب حالت میں چل رہے ہیں۔ جب کہ ہندوؤں کے ادارے عام طور پر کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اس فرق کا سبب کیا ہے۔

عبد المعبود صاحب نے کہا کہ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ہندو اس کو پُن سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ اگلے جنم میں اس کو اس کا فائدہ ملے گا۔ مگر یہاں یہ سوال باقی رہتا ہے کہ مسلمانوں میں آخرت کا تصور اس سے زیادہ واضح شکل میں موجود ہے۔ پھر آخرت کا تصور ان کے لئے سماجی خدمت کا محرک کیوں نہیں بنتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس کا سبب موجودہ مسلم رہنما ہیں۔ موجودہ مسلمانوں میں ایسے لوگ تو بہت اٹھے جنھوں نے کچھ معروف مذہبی شکلوں میں آخرت کا فائدہ بتایا۔ مگر ایسے رہنما سرے سے پیدا ہی نہیں ہوئے جو سماجی اور انسانی خدمت کو آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بتائیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں مدرسہ اور مسجد جیسے کاموں کی تو خوب دھوم دکھائی دیتی ہے مگر سماجی اور انسانی خدمت والی سرگرمیاں ان کے یہاں بہت کم پائی جاتی ہیں۔

یکم جنوری کی صبح کو بہت سے ہندو میرے کمرہ میں آئے۔ ہر ایک نے کہا: ہیپی نیو ایر، ہیپی نیو ایر۔ میں نے کہا کہ آپ کے لئے بھی (same to you)۔ ایک صاحب نئے سال کی خوشی میں کا جو لا کر دینے لگے، وغیرہ۔

نئے سال کی آمد پر خوشی کا اظہار کرنا یا نہ کرنا بظاہر ایک سادہ سی بات ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ نفسیاتی نقطہ نظر سے یہ ایک بے حد اہم بات ہے۔ نئے سال کا اس طرح استقبال کرنا آدمی کے اندر

اس نفسیات کو جگاتا ہے کہ گردش زمانہ نے مجھے کام کرنے کا ایک اور سال دیا۔ اس کے برعکس نئے سال کی آمد پر اگر آپ کے احساس کی دنیا میں اس قسم کی کوئی ہلچل نہ پیدا ہو تو آپ کا حال اس کاہل انسان کا سا ہو جائے گا جس کے اوپر رات کا اندھیرا ختم ہو کر صبح کا اجالا آئے مگر وہ آنکھ بند کئے ہوئے بدستور اپنے بستر پر پڑا سوتا رہے۔

ایک بار کھانے کی میز پر ایک صاحب نے سوال کیا کہ اسلام میں بتایا گیا ہے کہ مؤمن کا جوٹھا شفاء ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ میڈیکل سائنس کی رو سے آپ اس کو کس طرح اکسپلین کریں گے۔

میں نے کہا کہ یہ سائنسی جملہ نہیں ہے بلکہ نفسیاتی جملہ ہے۔ اس کو لفظی معنی میں لینا درست نہیں۔ مخصوص صورت حال میں جب کہ گلاس ایک ہو اور پانی پینے والے ایک سے زیادہ ہوں تو وہاں کہہ دیا گیا کہ ایک ہی گلاس میں سب لوگ پی لو۔ اس کو مسئلہ نہ بناؤ۔ اس حدیث میں شفاء کا مطلب یہ ہے کہ ایسا کرنے سے انسانی محبت واخوت کا جذبہ بڑھے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ یہ چھوا چھوت کی نفسیات کو ختم کرنے کی ایک بات ہے نہ کہ طبی معنی میں کوئی علاج معالجہ کی بات۔

راج کرن سنگھ ایک نوجوان تھے جو بارہ بنکی سے آئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ آج کی سمسیا یہ ہے کہ لوگوں کی مانسکتا بدلتی جارہی ہے۔ نئی پیڑھی کے اندر بھلائی اور برائی کا فرق مٹتا جارہا ہے۔ ہمارا بھارتیہ سنسکار یہ تھا کہ دوسرے کے سکھ میں اپنا سکھ۔ نیا بھوتک واد یہ سکھاتا ہے کہ اپنا سکھ تو سب کا سکھ۔ ہمیں اس کو بدلنا ہے۔ نہیں تو سارے دیش کا ناس ہو جائے گا۔

مسٹر دیو کمار یادو ایڈوکیٹ (Tel. 55294) بانده سے آئے تھے۔ وہ وکالت کے ساتھ سماجی کام بھی کرتے رہتے ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ سماج سدھار کے کام کے لئے نقطۂ آغاز (اسٹارٹنگ پوائنٹ) کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ پہلا کام لوگوں میں ایکتا لانا ہے۔ جب تک مختلف فرقوں (خاص طور پر ہندو مسلم) میں ایکتا نہیں آئے گی، وکاس کا کوئی ٹھوس کام یا کوئی بڑا کام نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے سوچا کہ آج ہندستان کا ہر آدمی کسی نہ کسی الفاظ میں یہی بات کہہ رہا ہے۔ ہر ایک یہ محسوس کرتا ہے کہ ملک میں فرقہ وارانہ ایکتا ملک کی ترقی کے لئے پہلی اور لازمی شرط ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایکتا کیسے آئے۔ جب بھی دو فرقوں میں نزاع کی حالت قائم ہو جائے تو اکثر لوگ یہ انتظار کرنے لگتے ہیں کہ دونوں طرف سے پہل ہو اور دو طرفہ بنیاد پر اس مقصد کو حاصل کیا جائے۔ مگر تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ اس طرح کے معاملات میں دو طرفہ بنیاد پر کبھی اصلاح نہیں آتی۔ ایسے حالات میں اصلاح کا ایک ہی قابل عمل طریقہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک گروہ پہل کر کے یک طرفہ بنیاد پر جھگڑے کو ختم کر دے۔

عبدالکریم صاحب کشمیر سے آئے تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ یہ دہلی کی حکومت کی غلطی ہے کہ اس نے کشمیر میں بلٹ کا جواب بلٹ سے دینا شروع کیا۔ اسی سے مسائل پیدا ہوئے۔ اگر مہاتما گاندھی کے طریقہ کو اختیار کیا جاتا تو کشمیر کا مسئلہ پیدا ہی نہ ہوتا۔

تاہم میرا خیال ہے کہ یہ ایک آئیڈیلزم تو ہو سکتی ہے مگر وہ مسئلہ کا عملی حل نہیں۔ کشمیر کے نوجوانوں نے جب پڑوس کے دشمن ملک کی مدد لے کر کشمیر میں گن کلچر کا آغاز کر دیا تو اس کے بعد عملی طور پر یہ ناممکن تھا کہ نئی دہلی کی طرف سے اس کا جواب میں پھول کلچر چلایا جائے۔ اب کشمیر کے مسئلہ کا یہ حل نہیں ہے کہ کشمیر کے لوگ دہلی سے یہ مانگ کریں کہ آپ لوگ گولی کا جواب گولی سے نہ دے کر گولی کا جواب پھول سے دیجئے۔ اس مسئلہ کا ممکن حل صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ کشمیر کے لوگ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے ہتھیار پھینک دیں۔ پڑوسی ملک سے تعلق کو ختم کر دیں اور پر امن طور پر گفت وشنید کی میز پر آجائیں۔ اس کے سوا ہر دوسری بات صرف خوبصورت لفظ ہے، وہ مسئلہ کا خوبصورت حل نہیں۔

چترکوٹ کا جلسہ ایک عوامی جلسہ تھا۔ یہاں کا اصول یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ افراد کو بولنے کا موقع دیا جائے۔ چنانچہ پانچ منٹ، دس منٹ کے وقت میں بہت سے لوگ بولے۔ یہاں کے تجربہ اور دوسرے تجربات کو دیکھتے ہوئے میں نے مسٹر پنچم لال سے کہا کہ دنیا میں سب سے کم (rarest among the rare)

جو چیز ہے وہ ایسے افراد ہیں جن کے اندر ہم آہنگ سوچ ہو۔ مجھ کو ہر آدمی کا دماغ طرح طرح کی باتوں کا ایک ڈھیر نظر آتا ہے۔ انھوں نے مجھ سے اتفاق کیا۔

یکم جنوری ۱۹۹۶ کو ساڑھے بارہ بجے ایک صاحب منچ پر آئے۔ ان کا نام رام گاندھی تھا۔ اور ان کی عمر ۸۰ سال تھی۔ ان کا حلیہ، ان کا لباس بالکل مہاتما گاندھی جیسا تھا۔ وہ ایک لاٹھی لئے ہوئے اور بالکل گاندھی کی طرح چلتے ہوئے منچ پر آئے۔ وہ گاندھی جیسی عینک لگائے ہوئے تھے۔ وہ گاندھی کے اتنا زیادہ مشابہہ تھے کہ وہ گاندھی کا زندہ اسٹیچو معلوم ہوتے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ دیش کے لوگوں کے لئے دوشبدوں میں آپ کا سندیش کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ گاندھی جی کے راستہ پر چلنے ہی سے دیش کا کلیان ہوگا۔

سومنا دیدی ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ بابا صاحب (ونوبا جی) کہا کرتے تھے کہ کل کی دنیا کو مہیلا چلائے گی۔ انھوں نے کہا کہ اس کو پورا کرنے کے لئے ہم مہیلاؤں کو تیاری کرنا چاہئے۔

یہ بات کہ فلاں گروہ دنیا کو چلائے گا، فلاں گروہ دنیا کی امامت کرے گا۔ یہ میرے نزدیک صرف سادہ لوحی کی بات ہے۔ دنیا کی امامت کون کرے، اس کا فیصلہ براہ راست خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ کوئی گروہ نہ دعویٰ کے ذریعہ دنیا کا امام بن سکتا ہے اور نہ خود ساختہ تیاری کے ذریعہ۔

ایک مقرر نے بڑے جوش کے ساتھ کہا: گاندھی نے غلامی کو ختم کیا۔ انھوں نے ہم کو آزاد ہندستان دیا۔ میں نے سوچا کہ اس قسم کی باتیں آج ہر جگہ کہی جارہی ہیں۔ پاکستان کے لوگ کہتے ہیں کہ ہندو قیادت کسی بھی طرح پاکستان بننے دینا نہیں چاہتی تھی۔ مسٹر محمد علی جناح نے اپنی بے مثال قیادت کے ذریعہ پاکستان کو بنوایا۔ اسی طرح کسی مسلم ادارہ میں جایئے تو وہاں اپنے حضرت کی قصیدہ خوانی ہورہی ہوگی۔ اور ادارہ کی ساری ترقی حضرت کے حصہ میں ڈالی جارہی ہوگی۔

خدا کی زمین پر کوئی بھی نہیں جو خدا کی تعریف کرے۔ جس کا سینہ اس احساس سے لبریز ہو جائے کہ جو کچھ اس کو ملا ہے وہ خدا کے دینے سے ملا ہے۔ اگر خدا نہ دیتا تو وہ کچھ بھی پا نہیں سکتا تھا۔

۳۱ دسمبر کو آخری سیشن تھا، ۲ بجے دن میں میری تقریر تھی۔ خلاصہ یہ تھا کہ آپ کو میرا آخری سندیش صرف ایک ہے'' آشاوادی بنئے اور نراشا کو چھوڑ دیجئے''۔ میں نے کہا کہ پچھلی رات کو جب میں گیسٹ ہاؤس میں سونے گیا تو ہر طرف اندھیرا چھا چکا تھا۔ لیکن آج جب میں سو کر اٹھا تو سورج نکل آیا اور دوبارہ چاروں طرف اجالا پھیل گیا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ خدا اس طرح اپنے بندوں کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ اس دنیا میں ہر اندھیرے کے بعد اجالا ہے۔ یہاں ہر نہیں میں ہے کا امکان چھپا ہوا ہے۔ یہ دنیا کبھی سمسیاؤں سے خالی نہیں ہوسکتی۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا کہ سارا سماج ویسا ہی ہو جائے جیسا کہ ہم چاہتے ہیں۔ ایسی حالت میں کرنا کیا ہے۔ کرنا یہ ہے کہ سمسیاؤں میں جینا سیکھئے۔ آپ جانتے ہیں کہ گلاب کے پیڑ میں جہاں پھول ہوتے ہیں۔ وہیں کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ آپ کتنا ہی بلڈوزر چلائیں مگر جب بھی گلاب کی شاخیں دوبارہ نکلیں گی تو ان میں پھول کے ساتھ کانٹے بھی ہوں گے۔

یہ فطرت کا خاموش پیغام ہے کہ اگر پھول چاہتے ہو تو کانٹوں کو نظر انداز کرو۔ جب آپ کانٹوں سے اپنی نگاہیں ہٹالیں تو سارا باغ آپ کو پھول ہی پھول دکھائی دے گا۔ یاد رکھئے، زندگی کانٹوں سے نباہ کرنے کا نام ہے، کانٹوں کے خلاف شور کرنے کا نہیں۔ زندگی صبح کے انتظار کا نام ہے، رات کے آنے پر واویلا کرنے کا نہیں۔

مسٹر راگھوندر کمار سجان دوہندی اخباروں کے کرسپانڈنٹ ہیں۔ آج (کانپور) اور نوکرم یگ پرکاشن (باندہ)۔ انھوں نے تفصیل کے ساتھ اپنے اخبار کے لئے انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ ہندو مسلم مسئلہ اخباروں میں جتنا زیادہ دکھائی دیتا ہے، حقیقت میں وہ اتنا زیادہ نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بہت کم ہے۔

علاقہ کے تمام اخباروں میں جلسہ کی رپورٹنگ ہوئی۔ دینک جاگرن (کانپور) نے اپنے شمارہ یکم جنوری میں جو رپورٹ شائع کی، اس کا ایک حصہ یہ تھا: دہلی سے آئے ہوئے مولانا وحیدالدین نے کہا کہ'' اسلام پیار کا گرنتھ ہے، اور نمرتا اس کا پہلا سبق ہے۔ انھوں نے کہا کہ پیار اور شانتی بھرے سینہ

سے ہی دیش کو آگے لے جایا جاسکتا ہے۔قرآن میں بتائی ہوئی کسوٹی پر کھرا اترا مسلمان شانتی کا سمر تھک ہوتا ہے''۔

یکم جنوری ۱۹۹٦ نئے سال کا پہلا دن تھا۔صبح کو میں گیسٹ ہاؤس کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ اور خاموشی کے ساتھ اپنا احتساب کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ میری عمر اب کافی ہوگئی، میں بڑھاپے کے مرحلے میں داخل ہو گیا۔اور اب تک شاید میں کچھ نہ کرسکا۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عمر بے کار گزر گئی۔

میں نے دو چیزوں کو اپنی کوششوں کا نشانہ بنایا تھا۔مسلمانوں کے اعتبار سے یہ نشانہ کہ موجودہ مسلم نسلوں کے لئے اسلام کو ان کی ازسرنو دریافت (re-discovery) بناؤں۔ دوسری طرف ہندوؤں کے اعتبار سے میرا نشانہ یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور تناؤ ختم ہو۔ دونوں فرقوں کے درمیان معتدل حالات میں اختلاط ہونے لگے۔مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نہ پہلا مقصد پوری طرح حاصل ہوا اور نہ دوسرا مقصد۔

یکم جنوری ۱۹۹٦ کی شام کو واپسی کا دن تھا۔مغرب کی نماز گیسٹ ہاؤس میں پڑھی۔اس کے بعد پروفیسر ہاشم قریشی اور دوسرے لوگوں کے ساتھ ڈائننگ ہال میں کھانا کھایا۔کھانا بالکل سادہ تھا ــــــــــ روٹی، دال، سبزی، چاول۔وہ بالکل میرے ذوق کے مطابق تھا۔اس طرح کا سادہ کھانا میں شوق سے کھاتا ہوں۔جس ''پرتکلف کھانے'' کو لوگ ڈٹ کر کھاتے ہیں، اس کے بارہ میں میرا احساس اکثر ان الفاظ میں ڈھل جاتا ہے:

Mere sight is horrible.

اس کے بعد ریلوے اسٹیشن کے لئے روانگی ہوئی۔ہلکی بارش کا موسم تھا۔اندیشہ تھا کہ کہیں سمیلن کے دوران بارش شروع ہوگئی تو سارا انظام درہم برہم ہوجائے گا۔مگر عجیب بات ہے کہ تین روزہ سمیلن پورے سکون کے ساتھ انجام پایا۔اور جیسے ہی یکم جنوری کی سہ پہر کو پروگرام ختم ہوا فوراً بارش شروع ہوگئی۔

اسٹیشن پر کچھ وقت ویٹنگ روم میں گزرا۔ یہ ایک عبرت انگیز تجربہ تھا۔ اس کی تفصیل الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ البتہ ایک تجربہ کا مختصراً ذکر کروں گا۔

ریلوے اسٹیشن پر ۸۰ سال کے ایک دیہاتی شخص بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا نام رام سرن بھائی تھا۔ وہ پورنیہ کے ایک گاؤں سے سمیلن میں شرکت کے لئے آئے تھے اور اب واپس جا رہے تھے۔ انھوں نے آزادی کی جنگ میں حصہ لیا۔ وہ جیل گئے، اور مصیبتیں اٹھائیں۔ مگر آزادی کے بعد انھیں اس کا کوئی فائدہ حاصل نہ ہوسکا۔ وہ اپنے پورے وجود سے مفلوک الحالی کی ایک زندہ تصویر تھے۔ ان کے نزدیک، وہ اسّی فی صد بھارت کی نمائندگی کر رہے تھے۔ ان کے تلخ تجربات نے انھیں کوی بنا دیا تھا۔ وہ ایک کے بعد ایک دردمندانہ انداز میں اپنی کویتائیں حاضرین کو سناتے رہے۔ یہ تمام کویتائیں آزاد ہندستان میں بھرشٹا چار اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف احتجاج تھیں۔ ان کے اشعار کو میں محفوظ نہ کر سکا۔ دو الگ الگ مصرعے یہ تھے:

جب خود مانجھی پاگل ہو پتوار بدل کر کیا ہوگا
دردشا مجبور کی مجبور ہو کر دیکھئے

کویتا سناتے سناتے وہ تقریر بھی کرنے لگتے تھے۔ ایک بار انھوں نے کہا ''ہارا ہوا شکایت کرتا ہے، تم ہارے ہوئے ہو اسی لئے شکایت کر رہے ہو۔''

مذکورہ کوی کا مصرعہ: 'جب خود مانجھی پاگل ہو پتوار بدل کر کیا ہوگا'، جب میں نے سنا تو مجھے خیال آیا کہ یہ شعر اس صورت حال کے لئے ہے جب کہ کشتی درست ہو لیکن اس کا ملاح ٹھیک آدمی نہ ہو۔ تاہم ایک اور صورت حال ہے جب کہ خود کشتی ہی بوسیدہ ہو کر ٹوٹ رہی ہو، ایسی حالت میں پہلا کام ملاح کو بدلنے کا نہیں ہے بلکہ کشتی کو درست کرنے کا ہے۔ اس دوسری صورت حال کے لئے زیادہ صحیح مصرعہ یہ ہوگا:

جب کشتی ٹوٹی ہو ملاح بدل کر کیا ہوگا

چتر کوٹ سے دوبارہ ''مہا کوشل اکسپریس'' کے ذریعہ واپسی ہوئی۔ ٹرین کا یہ سفر معمول کے

مطابق تھا۔ میں اپنی برتھ پر سوگیا۔ جلد ہی نیند آ گئی۔ سفر اگر چہ بارہ گھنٹے کا تھا۔ مگر وہ رات کا سفر تھا۔ اس لئے بیشتر سفر سوتے ہوئے گزر گیا۔

۲ جنوری ۱۹۹۶ کو صبح آٹھ بجے میں مہا کوشل اکسپریس میں سفر کرتے ہوئے یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ ٹرین تیزی سے دہلی کی طرف چلی جارہی ہے۔ جب کہ نشست کے اعتبار سے میرا رخ اس کے الٹی طرف ہے۔ اس طرح کے واقعہ کو لے کر ایک صاحب نے لکھا ہے کہ ٹرین کو اس کا انجن چلاتا ہے۔ ٹرین اسی طرف جائے گی جدھر اس کا انجن اسے لے جانا چاہتا ہو۔ ٹرین کے اندر بیٹھے ہوئے مسافر اگر اپنا رخ الٹی طرف کرلیں تب بھی وہ ادھر ہی جائیں گے جدھر ٹرین کا انجن بھاگا چلا جارہا ہے۔

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ یہی مثال زندگی کی ہے۔ انسانی زندگی ایک لمبی ٹرین کے مانند ہے جس کو سیاسی اقتدار کا انجن چلاتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اہل جاہلیت نے زندگی کے انجن پر قبضہ کرلیا ہے۔ چنانچہ ٹرین تمام مسافروں کو جاہلیت کی منزل کی طرف لئے چلی جارہی ہے۔ اب جو لوگ انسانیت کو بچانا چاہتے ہیں، ان کا پہلا کام ہے کہ وہ سیاسی اقتدار کے انجن پر قبضہ کریں۔

یہ نظریہ نہایت گمراہ کن ہے۔ ۱۹۴۷ میں مہاتما گاندھی نے غیر مطلوب لوگوں سے اقتدار کا انجن چھینا۔ ۱۹۷۷ میں جے پرکاش نرائن نے اقتدار کا انجن چھینا۔ اسی طرح پاکستان میں ضیاء الحق نے اقتدار کا انجن چھینا۔ بنگلہ دیش میں شیخ مجیب الرحمٰن نے ۱۹۷۱ میں اقتدار کا انجن چھینا۔ یہی واقعہ مصر اور دوسرے مسلم ملکوں میں پیش آیا۔ ہر جگہ لوگ مفروضہ غیر مطلوب افراد سے اقتدار کا انجن چھینتے رہے۔ مگر نتیجہ ہر جگہ صفر رہا۔

نئی دہلی کے اخبار قومی آواز کے شمارہ ۲ جنوری ۱۹۹۶ میں سید شہاب الدین صاحب کا ایک بیان نظر سے گزرا۔ اس میں انھوں نے ''ملی پارلیمنٹ'' کی مذمت کی تھی جو اپنے اعلان کے مطابق، خدا کے آخری رسول کی امت کو کفار و مشرکین کے سیاسی اتباع سے نجات دلانے کے لئے اٹھی ہے۔ اور ہندستانی مسلمانوں کو ایک اسلامی سیاسی رخ عطا کرنا چاہتی ہے۔ سید شہاب الدین صاحب نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ ملی پارلیمنٹ کی اس قسم کی سرگرمیوں سے ہندو تنظیموں کو مسلمانوں

کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ نام نہاد ملی پارلیمنٹ کا یہ اعلان کہ اس کا مقصد ہندستان کے مسلمانوں کو مشرکین کی سیاسی غلامی سے نجات دلانا ہے، ملک کے آئین اور اس کے سیاسی ڈھانچہ سے متصادم ہے۔

سید شہاب الدین صاحب کی یہ بات بجائے خود درست ہے۔ مگر سید شہاب الدین صاحب خود بھی ۱۹۹۲ کے آخر تک اسی قسم کی ٹکراؤ والی تباہ کن سیاست کے قائد بنے رہے۔ اسی کو کہتے ہیں: خود را فضیحت دیگراں را نصیحت۔

اسی اخبار کی ایک خبر یہ تھی کہ جموں وکشمیر کے ڈائرکٹر جنرل آف پولیس مسٹر ایم این سبھروال نے بتایا ہے کہ ریاست میں ۱۹۹۵ میں انتہا پسندوں نے سب ملا کر ۵۴۸ شخصوں کا اغوا کیا۔ پچھلے چھ برسوں کے اندر اغوا کئے جانے والے افراد کی یہ سب سے بڑی تعداد ہے۔ ریاست میں اکتوبر ۱۹۸۹ میں تشدد کے آغاز کے بعد سے اب تک تقریباً سولہ سو افراد اغوا کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ۲۰۷ کو اغوا کاروں نے قتل کر دیا۔

کشمیر کی متشددانہ تحریک اسلام کے نام پر چلائی جارہی ہے۔ حالانکہ اس طرح کا اغوا اور قتل اسلامی شریعت میں سراسر حرام ہے۔ عجیب بات ہے کہ وہ علماء جو مسلم پرسنل لاء کے معاملہ میں شریعت سے معمولی انحراف پر بیانات کا اور تقریروں کا طوفان برپا کرنے کے لئے اپنے حجروں سے باہر نکل آتے ہیں، اتنے بڑے غیر شرعی فعل کے بارے میں مکمل طور خاموش ہیں۔

ہمارے ڈبہ میں ایک مرد اور عورت اپنے تقریباً آٹھ سالہ بچہ کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ایک بار میں نے سنا کہ لڑکا اپنے باپ سے پوچھ رہا ہے کہ میری ممی کہاں گئی۔ غالباً وہ ٹائلٹ میں گئی ہوئی تھی۔ باپ نے جواب میں پوچھا کہ تم کو کیا کام ہے ممی سے۔ بچہ فوراً نہایت سخت لہجہ میں بولا: آپ کو اس سے کوئی مطلب نہیں۔ اور باپ بالکل خاموش رہا۔

اس قسم کی باتیں بار بار دیکھنے اور سننے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہی وہ زمانہ ہے جس کی پیشین گوئی حدیث رسول میں کی گئی تھی۔ موجودہ زمانہ میں لوگوں کی اولاد ہی ان کا معبود ہے۔ قدیم

زمانہ میں انسان مفروضہ طور پر خدا کی بیٹیوں کی پرستش کرتا تھا، آج پرستش کا یہی معاملہ لوگ خود اپنے بیٹوں اور بیٹیوں سے کر رہے ہیں۔

۲ جنوری ۱۹۹۶ کو ٹرین چلتی ہوئی نظام الدین ریلوے اسٹیشن پر پہنچی۔ مقرر وقت کے مقابلہ میں وہ تقریباً پانچ گھنٹہ لیٹ ہو چکی تھی۔ میں باہر نکل کر پلیٹ فارم پر آیا تو ریلوے والوں کی طرف سے لاؤڈ اسپیکر پر مسافروں کو یہ پیغام دیا جا رہا تھا: ''صاف صفائی کو ہم اپنا آدرش بنائیں گے۔''

لاؤڈ اسپیکر اور پریس کے دور میں جو نئی چیزیں ظہور میں آئی ہیں، ان میں سے ایک عجیب چیز یہ ہے کہ اپنی ذاتی ذمہ داری کے اعتبار سے ہر آدمی آدرش کو نظر انداز کئے ہوئے ہے، مگر ہر آدمی دوسروں کو آدرش کا سبق دینے کا چیمپین بنا ہوا ہے۔